الفوز الکبیر

مع

اصول تفسیر

علامہ ابن تیمیۃ الحرانیؒ

حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہؒ

الفوز الکبیر

مصنفہ

حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ

ترجمہ

محمد سلیم عبداللہ

ترجمہ رسالہ اُصول تفسیر

مصنفہ

علامہ ابن تیمیۃ الحرّانیؒ

توضیح وترجمہ

خالد ابن القاسم انصاری

ترتیب وتدوین

منیر احمد نعیم لائبریرین (ریٹائرڈ)

گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور

الفیصل
ناشران وتاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

297.122601 Wali ullah,Hazrat Shah
Al-Fauz-ul-Kabir/Hazrat Shah Wali ullah.
Rasalah Asool-e-Tafseer/IbnTimia Al-Harrani.
Lahore : Al-Faisal Nashran, 2005.
188p.

1.Quran-Tafseer-Asool i. Title Card.
Ii.Ibn Timia Al-Harrani
ISBN 969-503-378-4

مارچ 2005ء

محمد فیصل نے

تعریف پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔

قیمت -/75 روپے

AL-FAISAL NASHRAN
Ghazni Street,Urdu Bazar,Lahore.Pakistan
Phone : 042-7230777 Fax : 09242-7231387
http : www.alfaisalpublishers.com
e mail : alfaisal_pk@hotmail.com

فہرست

ترجمہ رسالہ اصول تفسیر

الفوز الکبیر

مصنفہ

حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ

ترجمہ

محمد سلیم عبداللہ

❁ ❁ ❁

تمہید

اللہ تعالیٰ نے اس حقیر بندے کو بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ ان میں سب سے بڑی نعمت قرآن فہمی کی توفیق ہے پھر مجھ پر حضرت رسالت مآب ﷺ کے بہت احسانات ہیں جن میں سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ آپ نے قرآن مجید مجھ تک پہنچایا۔ اس طرح کہ قرنِ اوّل میں صحابۂ کرامؓ کو قرآن سکھایا۔ پھر انہوں نے دوسرے دور میں تابعین کو سکھایا۔ اس طرح بتدریج اس سے متعلق روایت اور درایت اِس ناچیز کے حصے میں آئی۔ (یا اللہ، اُس نبی کریم ﷺ پر رحمت فرما جو ہمارے آقا اور ہمارے شفیع ہیں، ایسی رحمت جو بہترین ہو اور بہت بابرکت ہو۔ اُس کے آل واصحاب اور سارے علمائے امت پر بھی رحمتیں نازل فرما۔)

مجھ حقیر کا نام ولی اللہ بن عبدالرحیم ہے (دونوں پر اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم ہو) جب اللہ تعالیٰ نے مجھے قرآن فہمی کی توفیق بخشی تو میں نے چاہا کہ ایک مختصر سی کتاب میں بعض مفید نکات کی وضاحت کروں جن سے شائقین کو کتاب اللہ کے سمجھنے میں مدد ملے۔ چنانچہ میں یہ کتاب پیش کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی بے انتہا مہربانی سے مجھے امید ہے کہ صرف ان قواعد کو سمجھ لینے کے بعد علومِ قرآن کے طلبہ کے لئے قرآن کے سمجھنے کی ایک وسیع شاہراہ کھل جائے گی۔ جن شائقین نے تفاسیر کے مطالعے میں ایک مدت صرف کی ہے یا عرصے تک مفسرین قرآن سے (جن کی تعداد اس زمانے میں بہت کم ہے) تفسیر پڑھتے رہے ہیں، وہ اس کتاب کی ترتیب وانضباط سے زیادہ مستفید ہوسکیں گے۔ میں نے اس کتاب کا نام **الفوز الکبیر فی اصُولِ التفسیر** رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ توفیق اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ملتی ہے، اسی لئے میں اسی پر بھروسہ کرتا ہوں۔ وہی میرے لئے کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔

اس کتاب کے مضامین پانچ ابواب میں منقسم ہیں۔

باب اوّل

اُن پانچ علوم کا بیان جن کی وضاحت قرآن عظیم نے کی ہے

قرآن مجید کے مضامین ان پانچ علوم پر مشتمل ہیں:

(۱) علم الاحکام۔ جس میں واجب، مستحب، مباح، مکروہ اور حرام کا بیان ہوتا ہے خواہ یہ سب عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات سے، یا معاشرتی امور سے یا مدنیات (یا نظام ریاست) سے۔ اس علم کی تفصیل اہل فقہ (یعنی علمائے شریعت) کا کام ہے۔

(۲) علمِ مباحثہ۔ اس میں یہود، نصاریٰ، مشرکین اور منافقین چاروں گمراہ فرقوں سے مباحثہ ہوتا ہے۔ اس علم کی تفصیل ''متکلمین'' کا کام ہے۔

(۳) علمِ تذکیر بآلاء اللہ۔ (یعنی اللہ کی نعمتوں کے بیان کرنے کا علم) اس میں زمین و آسمان کے پیدا کرنے، بندوں کو ان کی ضروریاتِ زندگی الہام کرنے، نیز اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ کا بیان ہوتا ہے۔

(۴) علمِ تذکیر بایام اللہ۔ اس میں ان تاریخی ایام کا بیان ہوتا ہے، جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے فرماں بردار بندوں کو بطور جزا کامیاب فرمایا اور مجرموں پر عذاب نازل کر کے عبرت کا سامان کر دیا۔

(۵) علمِ تذکیرِ موت۔ اس میں موت اور اس کے بعد آنے والے واقعات مثلاً حشر و نشر، حساب، میزان، جنت، دوزخ کا بیان ہوتا ہے۔

ان میں سے آخری دونوں علوم کو محفوظ رکھنا اور ان کے مناسب احادیث و آثار کو پیش کرنا واعظین اور ناصحین کا کام ہے۔

قرآنِ مجید میں ان علوم کا بیان قدیم عربوں کے طرزِ بیان کے مطابق ہے۔ متاخرین کا اسلوب اختیار نہیں کیا گیا۔ جو آیات احکام سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں اختصار سے کام نہیں

ایا گیا ہے، جیسا کہ عام طور پر انشا پردازوں کا طریقہ ہے۔ اور کسی فن کے اصول بیان کرنے والوں کی طرح غیر ضروری قیود کے قاعدوں سے بھی بحث نہیں کی گئی ہے۔

علمِ مباحثہ کی آیات میں مشہور و معروف اقوال اور مفید طرزِ خطابت کا التزام کیا گیا ہے۔ دلائل میں منطقی طرز اختیار نہیں کیا گیا۔ اور ایک مضمون کے بعد دوسرا مضمون شروع کرنے میں مناسبت کی رعایت بھی ملحوظ نہیں رکھی گئی، جیسا کہ عام طور پر انشاء پردازوں کا قاعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس حکم کو اپنے بندوں کے لئے اہم سمجھا، اسے بیان کر دیا۔ کوئی حکم پہلے بیان ہو جائے یا بعد میں۔ عام مفسرین نے ہر ایک آیت کو خواہ وہ مباحثہ کی ہو یا احکام کی کسی قصے کے ساتھ مربوط کیا ہے۔ اور اس قصے کو اُس آیت کے نازل ہونے کا سبب بتایا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نزولِ قرآن سے اصلی مقصد نفسِ انسانی کی تہذیب اور باطل عقائد اور فاسد اعمال کی تردید ہے۔

پس عوام میں باطل عقائد کے سبب سے آیاتِ مباحثہ نازل ہوئیں۔ اور ان میں فاسد اعمال اور مظالم کی اصلاح کے لئے آیاتِ احکام اتاری گئیں۔ اسی طرح آیاتِ تذکیر کے نزول کا سبب عوام کو غفلت سے بیدار کرنے کے لئے ہے جن میں یا تو اللہ کی نعمتوں کا بیان کیا گیا ہے۔ یا عذاب و انقلاب کے تاریخی واقعات یاد دلائے گئے ہیں۔ یا موت اور اس کے بعد ہونے والے ہولناک واقعات کی وضاحت کی گئی ہے۔ جزئی واقعات کا جہاں بیان کیا گیا ہے وہ فی نفسہٖ مقصود نہیں ہیں۔ مگر صرف بعض آیتوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہ وہ آیتیں ہیں جو اُن واقعات کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو آنحضرت ﷺ کے زمانے میں یا اس سے کچھ پہلے واقع ہوئے۔ کیونکہ اِس اشارے سے سننے والے کے دل میں انتظار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ توجہ سے واقعہ کی تفصیل سُننا چاہتا ہے۔ اس لئے ہم پر لازم ہے کہ ان علوم کی تفصیل اس طرح کریں کہ جزئی واقعات کو بیان کرنے کی تکلیف نہ اُٹھانی پڑے۔

پہلی فصل

علمِ مُباحثہ کے بیان میں

قرآن مجید میں چاروں گمراہ فرقوں (یہود، نصاریٰ، مشرکین اور منافقین) سے مباحثے ہوئے ہیں۔ یہ مباحثے دو طرح کے ہیں۔ ایک میں صرف باطل عقیدے اور اُن کی برائیاں بیان کر کے نفرت ظاہر کی گئی ہے۔ اور دوسرے میں گمراہوں کے شبہات ظاہر کر کے معقول دلائل یا مؤثر خطاب سے انھیں رفع کیا گیا ہے۔ مشرکین اپنے آپ کو حنیف کہتے تھے۔ حنیف، وہ شخص ہوتا ہے، جو ملّتِ ابراہیمی کا پابند ہو۔ اور اس کے لازمی نشانات اختیار کیے ہوئے ہو، یہ لازمی نشانات یہ ہیں:

کعبے کا حج۔ اور اسے نماز کے وقت قبلہ بنانا۔ غسلِ جنابت، ختنہ۔ فطرت کے تمام خصائل۔ اشہر حُرم[1] کا احترام۔ کعبے کی تعظیم۔ نسبی اور رضاعی رشتے سے جو عورتیں حرام کی گئی ہیں انہیں حرام جاننا۔ حلال جانوروں کو حلق سے ذبح کرنا۔ اور اونٹ کو نحر سے (یعنی سرِ سینہ سے ذبح کرنا)۔ ذبح اور نحر سے مقصود بالخصوص حج کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہو۔

ملتِ ابراہیمی میں شرعی اعمال یہ تھے: وضو۔ نماز۔ روزہ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک۔ یتیموں اور مسکینوں کو صدقہ دینا۔ مشکلات میں ان کی امداد اور صلۂ رحم۔ اُن میں اعمال کی مدح بھی کی جاتی تھی۔ لیکن مشرکین بالعموم یہ سب کام چھوڑ چکے تھے۔ اور یہ خصائل ان سے مفقود ہو چکے تھے۔ قتل، چوری، زنا، ربا، لوگوں کا مال غصب کرنا، ان سب کاموں کی حرمت بھی

---

[1] اَشْہُرُ حُرُمٌ (یعنی ماہ ہائے حرام) چار مہینوں کو کہتے ہیں: محرم، رجب، ذوقعدہ اور ذوالحجہ۔ اس لیے کہ ان مہینوں میں جنگ حرام ہے۔

اصل ملت ابراہیمی میں ثابت تھی۔ لوگ ان پر اظہارِ نفرت بھی کرتے تھے۔ لیکن اکثر مشرکین ان پر عامل تھے۔ اور نفسانی خواہشات پر چلتے تھے۔ حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک یہ بات ثابت تھی کہ وہی آسمان اور زمین کا خالق ہے۔ بڑے بڑے حوادث و واقعات کا مدبّر ہے، رسولوں کے بھیجنے پر قادر ہے، بندوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دینے والا ہے، حوادث کو ان کے واقع ہونے سے پہلے وہی مقرر کرتا ہے، فرشتے اُس کے مقرب بندے اور تعظیم کے لائق ہیں۔ چنانچہ اُن کے اشعار میں کہیں کہیں ان سب چیزوں کا ذکر آتا ہے۔

اکثر مشرکین نے ان عقائد کو دوراز عقل ہونے، اور ان کے سمجھنے کی طرف میلان نہ ہونے کے باعث بہت سے شبہات کھڑے کر دیے تھے۔ مشرکین کی گمراہی یہ تھی کہ وہ شرک، تشبیہ اور تحریف کے قائل تھے۔ آخرت کے مُنکر تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت کو دوراز قیاس کہتے، بُرے اعمال اور طرح طرح کے ظلم پھیلاتے، نئی نئی بُری رسمیں ایجاد کرتے، اور اصلی عبادات کو مٹاتے جارہے تھے۔

(۱) **شرک**، یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور میں اُن صفات کو مانا جائے جو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے خاص ہیں۔ مثلاً: عالم میں تصرفات ارادے سے کرنا جسے "کُنْ فَیَکُوْن" سے تعبیر کیا گیا۔ یا علمِ ذاتی، جو نہ تو حواس کے ذریعے حاصل کیا گیا ہو، نہ عقل کی مدد سے، اور نہ خواب و الہام وغیرہ کے ذریعے سے۔ یا بیماروں کو شفا دینا، یا کسی شخص پر لعنت کرنا، اور اس سے ناراض ہونا جس کے باعث وہ تنگ دستی یا بیماری و بدبختی میں مبتلا ہو جائے۔ یا اُس پر رحمت بھیجنا جس کے سبب سے اس کی روزی میں کشائش، تندرستی اور نیک بختی حاصل ہو۔ ایسی ساری صفتیں فی الاصل اللہ تعالیٰ ہی کی ہیں۔

اُس زمانے کے مشرکین بھی جواہر (یعنی کائنات کی تمام چیزوں کی اصل) کو اور بڑے اہم امور کے پیدا کرنے میں اللہ کا شریک کسی کو نہیں جانتے تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو کوئی اُسے روک نہیں سکتا۔ بلکہ ان کا شرک ایسے امور کے متعلق تھا جو بعض بندوں کے ساتھ مخصوص تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ جس طرح عالی مرتبت بادشاہ اپنے مقربانِ خاص کو مُلک کے مختلف حصوں کا فرمان روا مقرر کرتا ہے اور بعض امور میں (جب تک ان سے متعلق شاہی حکم صادر نہ ہو) انھیں فیصلے کا اختیار دے دیتا ہے۔ وہ اپنی رعایا کی

چھوٹی چھوٹی باتوں کا انتظام خودنہیں کرتا بلکہ انہی حاکموں کے سپرد کر دیتا ہے۔ حاکموں کی سفارش ان کے ماتحت ملازمین کے حق میں قبول کر لی جاتی ہے۔

بس یہی حال بادشاہِ مطلق کا ہے۔ اس نے بھی اپنے خاص بندوں کو خدائی کا رتبہ بخشا ہے۔ جن کی رضا مندی اور ناراضی کا اثر دوسرے بندوں پر پڑتا ہے۔ اسی خیال کے تحت وہ بندگانِ خاص کے تقرّب کو ضروری خیال کرتے تھے۔ تاکہ اس طرح اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہوسکیں۔ اور جب اعمال کی جزا دی جائے تو ان کے حق میں شفاعت مقبول ہو۔ اس خیالی ضرورت کے پیشِ نظر وہ لوگ ان مقرّب بندوں کو سجدہ کرتے، ان کے لئے قربانی پیش کرتے، ان کے نام کی قسم کھاتے، اور وقت ضرورت ان کی قدرت سے مدد مانگتے۔ پھر پتھر پیتل وغیرہ سے ان کے بُت بنالئے اور ان بتوں کو ان کی ارواح کی طرف توجہ کا وسیلہ قرار دے دیا۔ رفتہ رفتہ جاہلوں نے ان بتوں ہی کو اصل معبود سمجھ لیا۔ اور بڑی گڑبڑ شروع ہوگئی۔

(۲) **تشبیہ**۔ اس سے مراد ہے انسانی صفات کو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے لئے ثابت کرنا۔ چنانچہ مشرکین ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں بتاتے تھے۔ اور یہ بھی کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی شفاعت قبول کرتا ہے، اگرچہ اس کی مرضی نہ ہو۔ جس طرح بادشاہ بڑے بڑے امراء و دولت کی سفارش کبھی کبھی مان لیتا ہے۔ چونکہ ایسے علم، قوتِ سمع اور قوتِ بصارت کو سمجھنا جو خدا کی شان کے لائق ہوں، اُن کے بس کی بات نہ تھی، اس لئے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ان صفتوں کو بھی اپنے علم، قوتِ سمع اور قوتِ بصارت پر قیاس کر لیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی جسمیت اور مکانیت کے قائل ہوگئے۔

(۳) **تحریف**۔ پہلے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد اپنے آباؤاجداد کی شریعت پر قائم تھی۔ حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تین سو سال پہلے ایک شخص عمرو بن لحی پیدا ہوا۔ اس نے ان لوگوں کے لیے بت بنائے اور ان کی عبادت کا طریقہ نکالا۔ اس کے علاوہ بحیرہ[1]

---

[1] بحیرہ۔ وہ اونٹنی یا بکری جو دس بار بچے دے چکی ہو۔ زمانۂ جاہلیت عرب میں ایسی اونٹنی کے کان چیر کر آزاد چھوڑ دیتے کہ جہاں چاہے چرے۔ جب وہ مر جاتی تو اس کا گوشت آدمی کھاتے، عورتوں کو نہ دیتے۔

سائبہ[1] اور حام[2] کا اختراع، پانسوں کے ذریعے تقسیم اور اس قسم کی دوسری باتیں ایجاد کیں۔

یہ جہلا بالعموم اپنے آباؤاجداد کی رسموں کو بطور دلیل پیش کرتے۔ انبیاءِ سابقین نے بھی اگرچہ حشر ونشر کے احوال بیان کئے ہیں۔ مگر اس تفصیل سے نہیں جیسی تفصیل قرآن مجید میں ہے اس لئے اکثر مشرکین زائد حالات سے واقف نہیں تھے۔ ان کو اپنی سمجھ سے باہر خیال کرتے تھے۔ یہ لوگ اگرچہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ بلکہ حضرت موسیٰؑ کی نبوت کے بھی قائل تھے۔ لیکن انبیاء کے بشری صفات ان کے باطنی جمال کے لئے حجاب تھے۔ ان کو تشویش تھی کہ آدمی کیسے اللہ کا قاصد یا پیام بر ہوسکتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی اُس تدبیر سے ناواقف تھے جو بعثتِ انبیاء کے لئے مقتضی ہے۔ اسی لئے وہ رسالت یا پیغمبری کو بعید از قیاس کہتے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ رسول وہی ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے مثل ہو۔ چنانچہ وہ اس بارے میں نامعقول اور لایعنی شبہات ظاہر کرتے۔ مثلاً یہ کہتے تھے کہ جو شخص کھانے پینے کی حاجت رکھتا ہو وہ نبی کیسے ہوسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرشتے کو نبی بنا کر کیوں نہیں بھیجا؟ کیا سبب ہے کہ ہر شخص پر وحی نہیں بھیجتا؟ علیٰ ہذا القیاس ایسے اور شبہات۔

اگر تم کو مشرکین کے ان عقائد و اعمال کو صحیح تسلیم کرنے میں تامل ہو تو اس زمانے میں تحریف کرنے والوں کو دیکھ لو۔ جو اسلامی ممالک میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ گزرے ہوئے اولیاء کی ولایت کو مانتے ہیں۔ مگر اپنے زمانے کے اولیاء کے قائل نہیں۔ قبروں اور آستانوں پر حاضری دیتے ہیں اور طرح طرح کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ غور کرو ان لوگوں میں تشبیہ اور تحریف نے کتنی جڑ پکڑ لی ہے! صحیح حدیث ہے:

لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلِكُمْ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ.

''تم ضرور پیروی کرو گے اپنے اگلے طریقوں کی بالکل قدم بہ قدم۔''

ان آفتوں میں سے کوئی آفت ایسی نہیں ہے جس میں آج کوئی نہ کوئی مبتلا نہ ہو۔ یا اس قسم کے عقیدے کا قائل نہ ہو۔

۱۔ سائبہ۔ وہ اونٹنی جو نذر مان لینے کی وجہ سے یا دس مادہ بچے دینے کی وجہ سے آزاد چھوڑ دی جاتی' اور اسے کوئی چارا پانی سے نہ روکتا۔ جب وہ مر جاتی تو اس کا گوشت مرد اور عورت دونوں کھاتے۔

۲۔ حام۔ وہ نر اونٹ جو ناقہ کو دس بار حاملہ کر چکا ہو اور بوڑھا ہو گیا۔ جاہلیت میں ایسے اونٹ کو آزاد چھوڑ دیا جاتا' اس پر نہ سواری کی جاتی' نہ اس سے اون حاصل کیا جاتا۔ وہ جہاں چاہتا چرتا پھرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں مبعوث فرمایا۔ آپ کو ملتِ حنیفیہ (یعنی اسلام) کو قائم کرنے کا حکم دیا۔ اور قرآن مجید میں عرب کے جہلا سے مباحثہ کیا۔ اس مباحثہ میں ملتِ حنیفیہ کے ان مسلمہ امور کو بطور دلائل پیش کیا جو ان میں باقی رہ گئے تھے۔ تا کہ ان پر الزام ثابت ہو جائے۔

ا۔ شرک کے جواب میں:

(۱) اس پر دلیل طلب کی۔ اور آبائی تقلید پر قائم رہنے کی دلیل کو رد کیا۔

(۲) یہ ثابت کیا کہ بندگانِ خاص اللہ تعالیٰ کے برابر نہیں ہو سکتے۔ ان کے برخلاف اللہ تعالیٰ انتہائی مراتبِ تعظیم کا مستحق ہے۔

(۳) تمام انبیاء اس عقیدے پر متفق تھے:

مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۔

''ہم نے تجھ سے پہلے جو بھی رسول بھیجا، اس کی طرف وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے پس تم میری ہی عبادت کرو۔''

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ o بِالْبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ط

''اور ہم نے تجھ سے پہلے آدمیوں کو رسول بنا کر واضح احکام اور کتابوں کے ساتھ بھیجا تھا۔ ان کی طرف وحی کی تھی پس پوچھ لو اہلِ ذکر سے اگر تم نہ جانتے ہو۔''

وَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ط قُلْ کَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْکِتٰبِ۔

''اور کافر کہتے ہیں کہ تو رسول نہیں ہے۔ کہہ دے اللہ گواہ کافی ہے تمہارے اور میرے درمیان، اور وہ جس کے پاس ''الکتاب'' کا علم ہے۔''

(۴) بتوں کی عبادت کی برائی کا بیان۔ اور یہ بیان کہ پتھر انسانی کمالات کے مراتب سے بہت گرے ہوئے ہیں۔ پھر وہ کیسے خدائی کے مرتبے کے لائق ہو سکتے ہیں۔ یہ

جواب خاص طور پر ایسے لوگوں کے لیے ہے جو بتوں کے بالذات معبود ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔

تشبیہ کے جواب میں یہ طریقہ اختیار کیا۔

(۱) اس پر دلیل طلب کی پھر آبائی تقلید پر قائم رہنے کی تردید کی۔

(۲) یہ بیان کیا کہ باپ بیٹے کا ہم جنس ہونا ضروری ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس رشتے کا اطلاق کیسے ہوسکتا ہے۔

(۳) جو چیز ان گمراہوں کے نزدیک مکروہ اور قابلِ مذمت ہے، اسے اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کرنا بری بات ہے۔

اَلِرَبِّکَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُونَ۔

کیا تیرے رب کے لیے بیٹیاں؟ اور اُن کے لیے بیٹے؟

یہ جواب خاص طور پر ایسے لوگوں کو دیا گیا جو عوامی باتوں اور شعر و شاعری کی وہمی و خیالی باتوں کے عادی تھے۔ اس وقت انہی کی اکثریت تھی۔

۳۔ **تحریف** کے جواب میں فرمایا کہ:

(۱) یہ مذہبی پیشواؤں سے منقول نہیں ہے۔

یہ ان لوگوں کی ایجاد و اختراع ہے جو معصوم نہیں تھے (یعنی خطا کار تھے)

۴۔ حشر و نشر کے مستبعد ہونے کے جواب میں مردہ زمین جیسی چیزوں کو زندہ کرنے کا بیان کیا۔ پھر اس پر قیاس کرنے کا حکم فرمایا اللہ کی قدرت میں جو امور شامل ہیں ان کی توضیح کر کے یہ بات ثابت کی کہ دوبارہ پیدائش ممکن ہو۔

۵۔ پیغمبروں کے مبعوث ہونے کو محال بتانے کے جواب میں فرمایا کہ:

(۱) پہلے زمانوں میں نبی ہوتے رہے ہیں۔

مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ۔

''ہم نے تجھ سے پہلے جو آدمی بھی رسول بنا کر بھیجا ان کی طرف وحی کی۔

وَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ط قُلْ کَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا م بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْکِتَابِ۔

''اور کافر کہتے ہیں کہ تو رسول نہیں ہے۔ کہہ دے میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ کافی ہے اور وہ جس کے پاس الکتاب کا علم ہے۔

(۲) رسالت کے محال ہونے کی تردید اس طرح بھی کی کہ ''رسالت سے مراد وحی ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ

''اے پیغمبر! کہہ دو کہ میں مثل تمہارے انسان ہوں مگر یہ کہ مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔''

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا

''بشر کے لیے ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس سے اللہ تعالیٰ کلام کرے، مگر یہ کہ وحی کے طور پر۔''

(۳) اسی جواب کے سلسلے میں فرمایا کہ جن معجزات کی فرمائش منکرِ رسالت کر رہے ہیں، ان کا واقع نہ ہونا ایسی مصلحت پر مبنی ہے جس کے سمجھنے سے ان کا علم قاصر ہے۔ اسی طرح ایسے شخص کو نبی بنانے میں جس سے وہ خوش ہیں، مگر اللہ تعالیٰ انھیں نبی بنانا نہیں چاہتا، یا کسی فرشتے کو پیغمبر نہ بنانے، یا ہر شخص پر وحی نہ بھیجنے میں بھی مصلحتیں ہیں جنہیں وہ نہیں سمجھ سکتے۔

چونکہ مخاطبین اکثر مشرک تھے، اس لئے یہ مضامین بہت سی سورتوں میں کئی طریقوں سے زوردار اور مؤثر انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ اور بار بار ان کی تکرار کی گئی ہے۔ ہاں، بے شک حکیمِ مطلق کا خطاب ان جاہلوں سے ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا اور ان بے وقوفوں کے مقابلے میں گفتگو ایسے ہی زور و تاکید سے ہونا ضروری تھا۔

ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ

یہ اندازہ ہے بہت غالب اور بڑے علم والے کا۔

یہودی توریت پر ایمان رکھتے تھے۔ ان کی گمراہی یہ تھی کہ انہوں نے احکامِ توریت میں تحریف کی تھی۔ تحریف لفظی بھی تھی اور معنوی بھی۔ نیز وہ بعض آیتیں چھپاتے، اور کچھ من گھڑت باتیں شامل کر دیتے تھے۔ احکام کی پابندی میں تساہل برتتے اور مذہبی تعصب میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو دور از قیاس بتاتے، اور آپ کی

شان میں بے ادبی اور طعن کرتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخانہ الفاظ کہتے تھے۔ بخل، حرص جیسی برائیوں میں بھی مبتلا تھے۔

تحریفِ لفظی کا ارتکاب توریت کے ترجمے وغیرہ میں کرتے تھے۔ اصل توریت میں نہیں۔ اس فقیر کے نزدیک یہی بات صحیح ہے۔ اور ابن عباسؓ کا قول بھی یہی ہے۔

تحریفِ معنوی، تاویلِ فاسد کو کہتے ہیں۔ یعنی کسی آیت کے معنی اس کے اصل معنی سے ہٹ کر بیان کرنا۔ اور اس طرح سیدھی راہ کو چھوڑ کر دوسری طرف کترا جانا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ہر مذہب میں ''دین دار فاسق'' اور ''منکر کافر'' کے درمیان فرق واضح کر دیا گیا ہے۔ مثلاً کافر کے بارے میں یہ حکم لگا دیا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ سخت عذاب میں مبتلا رہے گا۔ اور فاسق انبیاء کی شفاعت سے دوزخ سے نکل آئے گا۔ پھر اس ضمن میں ہر مذہب نے اپنے پیرووں کا نام ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ توریت میں یہودی اور عبری فاسق کو شفاعت سے متمتع ہونے کا مرتبہ بخشا گیا ہے، انجیل میں نصرانی کو اور قرآن عظیم میں مسلمانوں کو۔

حقیقت یہ ہے کہ اس فیصلے کا انحصار اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان، اور اُس نبی کی اطاعت پر ہے جو کسی قوم کی طرف بھیجا گیا ہو۔ نیز اُس کی شریعت پر عمل کرنے اور ممنوعات سے بچنے پر ہے۔ کسی فرقے کی ذاتی خصوصیت کی بنا پر نجات نہیں ہو سکتی۔ مگر یہودیوں کا گمان ہے کہ یہودی اور عبری دونوں ضرور جنت میں داخل ہوں گے۔ اور انبیاء کی شفاعت انھیں نصیب ہوگی:

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً۔

اور اُنہوں نے کہا کہ ہرگز ہمیں نہیں چھوئے گی آگ، مگر چند روز۔''

گویا وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر ان کا ایمان صحیح نہ بھی ہو، اور آخرت و رسالت پر ایمان کا کچھ حصہ وہ نہ بھی رکھتے ہوں تب بھی وہ کچھ دنوں دوزخ میں رہ کر انبیاء کی شفاعت سے نجات پا جائیں گے۔ حالانکہ یہ خیال بالکل غلط اور محض جہالت ہے۔ چونکہ قرآنِ عظیم اگلی کتابوں کا محافظ اور ان کے مشکل مقامات کو واضح کرنے والا ہے، اس لیے اس نے اس شبہ سے پردہ اٹھا دیا ہے:

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ

هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ٥

''بے شک جس نے برا عمل کیا اور اس کے گناہ نے اسے گھیر لیا تو ایسے ہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

دوسری مثال۔ ہر مذہب میں اس کے زمانے کے مصالح کے مناسب احکام دیے گئے۔ اور قانونِ شریعت بنانے میں قوم کی عادات و اطوار کا لحاظ رکھا گیا۔ اور اس پر ''ہمیشہ'' اعتقاد رکھنے اور عمل کرنے کی تاکید کی گئی۔ پھر انہی پر سچائی کو منحصر رکھا تو اس سے مُراد صرف یہ تھی کہ اس زمانے میں سچائی انہی باتوں پر منحصر ہے۔ وہاں ''ہمیشگی'' سے مُراد ظاہری ہمیشگی تھی نہ کہ حقیقی ہمیشگی۔ یعنی مطلب یہ تھا کہ جب تک دوسرا نبی نہ آئے اور اس کے چہرۂ نبوت سے پردہ نہ اٹھ جائے تب تک ہمیشہ ان احکام پر عمل واجب ہوگا۔ مگر یہودیوں نے اس ظاہری ہمیشگی سے یہ سمجھ لیا کہ یہودیت منسوخ ہونے کے لائق نہیں ہے حالانکہ یہودیت کی پیروی کی وصیّت ایمان اور اعمالِ صالحہ پر قائم رہنے کے لیے کی گئی تھی۔ اس مذہب کی کوئی ذاتی خصوصیت معتبر نہیں ہے۔ مگر ان لوگوں نے خصوصیت کا اعتبار کر کے یہ گمان کر لیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو یہودیت ہی کی وصیّت فرمائی تھی۔

تیسری مثال۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ملّت میں انبیاء اور ان کے تابعین کو مقرّب اور محبوب کا لقب بخشا ہے۔ اور جن لوگوں نے ملت کا انکار کیا، ان کی مذمت بُرے الفاظ میں کی ہے۔ دونوں صورتوں میں ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو ان کی قوم میں مستعمل تھے۔ تو اگر محبوب کی بجائے ابن کہہ دیا ہو تو تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ مگر اس سے یہودیوں نے یہ خیال کر لیا کہ یہ شرف صرف یہودی، عبری اور اسرائیلی ناموں کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ نہ سمجھا کہ اس سے مراد اطاعت، خضوع، اور اللہ کی مرضی کے مطابق چلنا ہے جس کے لیے اس نے انبیاء بھیجے تھے۔

اس طرح کی بہت سی فاسد تاویلیں ان کے دلوں میں جڑ پکڑ چکی تھیں، جنھیں وہ اپنے آباءواجداد سے سنتے چلے آئے تھے۔ قرآن مجید نے پوری طرح ان باتوں کی قلعی کھول دی۔

کتمانِ ایات ۔ یہودی توریت کی اصلی آیات اس وقت چھپاتے تھے، جب کسی معزز آدمی کی عزت محفوظ رکھنی ہوتی۔ یا کوئی ریاست حاصل کرنا مقصود ہوتا۔ اس چھپانے کا مقصد یہ ہوتا کہ عوام کا اعتقاد اٹھ نہ جائے، اور آیات کے مطابق عمل نہ کرنے پر وہ نشانۂ ملامت نہ بنیں۔

مثلاً توریت میں زانی کو سنگسار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ مگر یہودی علماء نے اتفاق رائے سے اس سزا کو موقوف کر کے اس کی جگہ دُرّے مارنے اور منہ کالا کرنے کی سزا تجویز کر دی تھی۔ اس لئے رسوائی کے خوف سے اصلی حکم کو چھپا رکھا۔ اور گھڑے ہوئے حکم کو اس کی جگہ دے دی۔

دوسری مثال یہ ہے کہ یہودیوں نے توریت کی ان آیات کی فاسد تاویل کی جن میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل (علیہما السلام) کو بشارت دی گئی ہے کہ ایک نبی ان کی اولاد میں مبعوث ہوگا۔ پھر ایک ایسی ملّت کا ذکر کیا گیا ہے جس کا ظہور اور جس کی اشاعت سرزمین حجاز میں ہوگی۔ اور جس کی لبیک کی آواز سے عرفات کی پہاڑیاں گونج اٹھیں گی۔ اور ہر سمت سے لوگ اس مقام کی زیارت کو آئیں گے۔ یہ باتیں توریت میں اب تک موجود ہیں۔ مگر یہودی ان کی تاویلِ فاسد اس طرح کرتے ہیں کہ یہ تو صرف اس ملّت کے آنے کی خبر ہے۔ اسے اختیار کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے:

مَلْحَمَةٌ كُتِبَتْ عَلَيْنَا. "یعنی جنگ و شورش ہمارے لئے توریت میں لکھی گئی ہے۔"

چونکہ اس کمزور تاویل کو کوئی نہ سنتا اور نہ کوئی اسے صحیح مانتا' اس لئے وہ آپس میں ایک دوسرے کو اسے چھپانے کی وصیت کرتے' اور خاص و عام پر اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ قرآن نے ان کا یہ راز فاش کر دیا:

اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ.

"کیا تم انھیں خبر دیتے ہو اس بات کی جو اللہ نے تم پر کھولی ہے' تاکہ وہ حجت پکڑیں اس سے تمہارے رب کے نزدیک؟

افسوس! یہودی کتنے جاہل تھے! اللہ تعالیٰ نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل (علیہما السلام) پر احسانِ عظیم فرمایا' اور اُن کی ملت کو اتنا بڑا شرف بخشا تو کیا اس سے ان کے دین کو اختیار کرنے کی تحریک و ترغیب سمجھ میں نہیں آتی؟

سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ.

"اے اللہ تو تمام نقائص سے پاک ہے، یہ بات بہتانِ عظیم ہے۔"

۲ **افتراء۔** یہودی علماء اور مشائخ میں حد درجے کا تشدد تھا وہ شارع کی تشریح کے بغیر ہی کسی مصلحت کی بنا پر بعض احکام گھڑ لیتے۔ ان بے ہودہ احکام کو پہلے رواج دیتے' پھر

انہیں اصل کتاب میں ملا دیتے' اور دعویٰ کرتے کہ ان کے اسلاف کا اس پر اتفاق رہا ہے اس لئے یہ دلیل قطعی ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار جو انہوں نے کیا' اس کی سند سلف کے اقوال کے سوا اور کوئی نہیں تھی۔ یہی حال اور بہت سے احکام کا ہے۔

توریت کے احکام پر عمل کرنے میں تساہل اور بے پروائی اور بخل و حرص کا سبب نفسِ امارہ کا اقتضاء ہے۔ نفسِ امارہ بلاشبہ ہر شخص پر غالب ہے۔ الا ماشاءاللہ۔

چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ۔

"بے شک نفس بڑا حکم کرنے والا ہے برائی کا مگر (اس صورت میں نہیں) جب کہ میرا رب رحم فرمائے۔"

اس رزیلت نے اہلِ کتاب میں ایک اور رنگ پیدا کیا تھا۔ وہ یہ کہ تاویلِ فاسد سے وہ اپنے مطلب کی بات کو صحیح ثابت کرنے پر بہت زور لگاتے اور اسے شرعی مسئلہ کی صورت میں ظاہر کرتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو بعید از قیاس کہنے کا سبب وہ اختلاف ہے جو انبیاء کے عادات و احوال میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً کسی کا زیادہ نکاح کرنا یا کسی کا کم۔ اور اسی طرح دوسرے امور میں اختلاف۔ شریعتوں میں اختلاف۔ انبیاء کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کے طریقے کا اختلاف۔ ان کے علاوہ یہ سبب بھی تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں مبعوث ہوئے، حالانکہ تمام انبیاء بنی اسرائیل سے ہوتے رہے وغیرہ وغیرہ۔

اس مسئلہ میں حق یہ ہے کہ نبوت دراصل نفوس عالم کی اصلاح اور ان کی عادات و عبادات کی درستی کے لیے ہوتی ہے۔ وہ نیکی اور بدی کے اصول ایجاد نہیں کرتی۔ عبادت' نظامِ معاشرت اور نظامِ تمدن میں ہر قوم کی مخصوص عادتیں (یا رسمیں) ہوتی ہیں۔ جب اس قوم میں کوئی نبی آتا ہے' تو یک بارگی ان کی ساری رسمیں ختم کر کے ان کی جگہ دوسری نئی رسمیں نہیں لے آتا' بلکہ وہ رسموں کو جانچتا ہے۔ جو با قاعدہ اللہ تعالیٰ کی رضا و منشا کے موافق ہوتی ہیں انھیں رہنے دیتا ہے' اور جو اس کے خلاف ہوتی ہیں اور ان میں بقدرِ ضرورت ترمیم کر دیتا ہے۔

تذکیر بآلاء اللہ[1] اور تذکیر بایام اللہ[2] میں بھی قوم کے گردو پیش کے احوال و واقعات پیش کئے جاتے ہیں جنھیں عام طور پر لوگ جانتے بوجھتے ہیں۔

یہی نکتہ ہے جس کی وجہ سے انبیاء کی شریعتوں میں اختلاف ہے، اس اختلاف کی مثال یہ ہے، جیسے ایک طبیب دو مریضوں کا علاج کرتا ہے، ایک کے لئے ٹھنڈی دوا اور ٹھنڈی غذا تجویز کرتا ہے، اور دوسرے کے لیے گرم دوا اور گرم غذا۔ غرض دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ طبیعت اصلاح پذیر ہو، اور مرض زائل ہو جائے۔ اسی طرح ہر ملک میں دوا اور غذا اس ملک کے طبعی حالات کے موافق ہوتی ہے' اور دوسرے مُلک سے مختلف۔ پھر ہر موسم میں اس کے موافق تدبیر اختیار کی جاتی ہے۔

ایسی ہی شانِ حکمت حکیمِ مطلق کی ہے۔ جب اس نے چاہا کہ نفسانی امراض کے مریضوں کا علاج کرے، ان کی طبیعت اور ملکی قوّت کو قوی کر کے تمام خرابیوں کو زائل کر دے تو اُس نے مختلف معالجے ہر زمانے کے مختلف اقوام کے مناسب تجویز فرمائے اور اس کے ساتھ ان کی عادات (رسوم) مشہورات و مسلمات کو مدِ نظر رکھا۔

اگر مسلمانوں میں یہودیوں کا نمونہ دیکھنا چاہو تو ''علماءِ سوء'' کو دیکھ لو جو دنیا کے طالب ہیں' سلف کی تقلید کے عادی ہیں، کتاب و سُنّت سے منہ پھیر چکے ہیں' عالموں کے غور وفکر سے نکلی ہوئی غیر مستند باتوں پر قائم ہیں۔ اور معصوم شارع (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام سے منحرف ہیں' اور موضوع حدیثوں اور فاسد تاویلوں کو اپنا رہنما بنا رکھا ہے۔

اب رہے نصاریٰ' تو وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے۔ ان کی گمراہی یہ تھی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو تین ایسے حصوں میں تقسیم کیا تھا' جو ایک لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا' اور دوسرے لحاظ سے تینوں ایک تھے۔ وہ ان تین حصوں کو ''اقانیم ثلاثہ'' کہتے تھے۔ ان میں ایک باپ ہے' جو مبدءِ عالم کے طور پر ہے' دوسرا بیٹا ہے جو بطور ''صادرِ اول'' ہے جو ''عام معنیٰ'' بن کر تمام موجودات میں شامل ہے۔ تیسرا حصہ روح القدس ہے جو عقولِ مجرّدہ کی جگہ ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ابن کے اقنوم (یعنی صادرِ اول) نے حضرت عیسیٰ کی روح کا لباس پہنا

---

[1] تذکیر بآلاء اللہ۔ اللہ کی نعمتوں کو یاد دلا کر نصیحت کرنا۔

[2] تذکیر بایام اللہ۔ بڑے بڑے تاریخی واقعات پیش کر کے عبرت و نصیحت کا سبق دینا۔

ہے۔ یا یوں کہو کہ بیٹے نے روحِ عیسیٰ کی صورت اختیار کر لی ہے' جس طرح جبریل علیہ السلام صورتِ انسان میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ حضرت عیسیٰ اِلٰـہ (یعنی معبود) بھی ہیں' اللہ کے بیٹے بھی' اور بشر بھی۔ اس لئے بشری اوصاف اور خداوندی صفات دونوں ان کی طرف منسوب کئے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ انجیل کی بعض آیتیں بطور دلیل پیش کرتے ہیں جن میں ابن کا لفظ وارد ہوا ہے۔ اور جن میں حضرت عیسیٰؑ نے بعض خداوندی افعال کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت عیسیٰؑ کے کلام میں تحریف نہیں ہوئی ہے۔ تو ہم یہ کہیں گے کہ قدیم زمانے میں ابن کا لفظ محبوب، مقرب اور مختار کے معنوں میں مستعمل تھا۔ جیسا کہ انجیل میں اکثر مقامات پر اس کے قرائن پائے جاتے ہیں۔

دوسری طرح سے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نسبت ایک ''اسلوبِ بیان'' ہے۔ جیسے کسی بادشاہ کا سفیر یوں کہے کہ ''ہم نے فلاں ملک فتح کیا۔ اور فلاں قلعہ پر قبضہ کر لیا۔'' تو اس سے مراد وہ خود نہیں ہوتا بلکہ بادشاہ ہوتا ہے۔ سفیر کی حیثیت بادشاہ کے ترجمان کی سمجھی جاتی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ عالمِ بالا سے وحی براہِ راست حضرت عیسیٰؑ کے لوحِ دل پر منقش ہوتی ہو اور حضرت جبریل صورتِ انسانی میں ان کے پاس آ کر کلام اِلقا نہ کرتے ہوں اس لیے حضرت عیسیٰؑ براہِ راست دل پر آئی ہوئی وحی کو بجنسہٖ ادا کر دیتے ہوں جس سے سننے والوں نے بظاہر افعالِ خداوندی کو ان کی طرف منسوب کرنے کا پہلو نکال لیا ہو۔ مگر حقیقت جو کچھ ہے وہ اپنی جگہ ہے۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے اس باطل مذہب کی تردید فرمائی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ عیسیٰؑ اللہ کا بندہ اور اس کی مقدس روح ہے' جسے اس نے مریم صدیقہ کے رحم میں پیدا کیا۔ اور اسے روح القدس کی تائید عطا فرمائی۔

اگر اللہ تعالیٰ ایسی روح کے لباس میں ظاہر ہوتا جو تمام ارواح کی ہم جنس ہے اور انسان کی صورت اختیار کرتا تو اس کے لیے لفظ ''اتحاد'' کا اطلاق موزوں اور درست نہیں ہو سکتا، اس

معنی کے لئے تقویم[1] جیسے الفاظ قریب تر ہو سکتے ہیں۔ تَعَالٰی عَمَّا یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا (اللہ تعالیٰ بہت بلند و برتر ہے، ان باتوں سے جو ظالم کہتے ہیں۔)

اگر تم نصاریٰ کا نمونہ اپنی قوم میں دیکھنا چاہو تو آج اولیاء و مشائخ کی اولاد کو دیکھ لو کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں ان کی بزرگی و شان کس طرح بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔

وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ۝

''اور عنقریب ظالموں کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس کروٹ پلٹتے ہیں''۔

نصاریٰ کی ایک گمراہی یہ بھی ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے قتل پر یقین رکھتے ہیں۔ حالانکہ دراصل ان کے واقعے میں ایک اشتباہ ہو گیا تھا۔ وہ جب آسمان پر اٹھا لیے گئے تو نصاریٰ نے یہ خیال کر لیا کہ وہ قتل کر دیے گئے۔ یہ غلط بات نسل در نسل نقل ہوتی رہی، آخر اللہ تعالیٰ نے قرآن عظیم میں اس شبہ کا ازالہ کر دیا۔ اور فرمایا:

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ.

''اور انہوں نے اسے نہ قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا، لیکن ان کو شبہ ہوا''

انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کا جو مقولہ مذکور ہے، اس سے مقصد یہودیوں کی جرأت اور اقدامِ قتل کے بارے میں صرف خبر دینا ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اس مہلکہ سے بچا لیا۔

حواریوں کا جو مقولہ انجیل میں آتا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ انھیں اشتباہ ہو گیا تھا۔ اور آسمان پر اٹھائے جانے کی انھیں خبر نہ ہوئی۔ یہ ایک انوکھا واقعہ تھا، جس سے ان کے ذہن اور کان مانوس ہی نہ تھے۔

نصاریٰ کی ایک گمراہی یہ بھی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جس فارقلیط کا وعدہ کیا گیا ہے، اس سے مراد حضرت عیسیٰؑ ہیں۔ جو قتل ہونے کے بعد حواریوں کے پاس آئے، اور انھیں انجیل پر قائم

---

[1] تقویم۔ فلسفے کی اصطلاح ہے۔ جوہر اور عرض کی بحث میں کہا جاتا ہے کہ جوہر وہ چیز ہے، جو بذاتِ خود قائم ہو، اور عرض وہ ہے جس کے قیام کے لیے جوہر کی (یا کسی چیز کی) ضرورت ہو۔ کاغذ پر رنگ یا تصویر عرض ہے اور کاغذ جوہر۔ ان دونوں میں جو کیفیت نسبت و تعلق پیدا کر دیتی ہے، وہ تقویم ہے۔

رہنے کی وصیت فرمائی اور فرمایا کہ میرے بعد نبوت کے دعویدار کئی ہوں گے تو جو شخص میرا نام لے، اسے سچا جاننا' ورنہ نہیں۔

قرآن مجید سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی بشارت ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر صحیح اترتی ہے۔ نہ کہ حضرت عیسیٰؑ کی روحانی صورت پر[۱]۔ کیونکہ انجیل میں ہے کہ ''فارقلیط تم میں مدت دراز تک رہے گا' علم سکھائے گا لوگوں کے ظاہر و باطن کو پاک کرے گا۔'' یہ باتیں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی سے ظہور میں نہیں آئیں۔ اب رہا حضرت عیسیٰ کا نام اختیار کرنا' تو اس سے مراد ان کی نبوت کی تصدیق ہے نہ یہ کہ ان کو خدا یا خدا کا بیٹا کہا جائے۔[۲]

منافق: منافق دو طرح کے تھے۔ ایک تو وہ جو زبان سے کلمۂ طیبہ پڑھتے' مگر ان کے دلوں میں کفر تھا۔ اور اس کفر کو وہ چھپائے رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۔

''بے شک منافق لوگ دوزخ کے پست ترین درجے میں ہوں گے۔''

دوسری قسم کے مُنافق وہ تھے' جو اسلام میں داخل تو ہوئے تھے مگر ان کا ایمان کمزور تھا۔ ان میں بعض وہ تھے جو اپنی قوم کے طریق پر چلتے۔ ان کی قوم ایمان لاتی تو وہ بھی ایمان لاتے' اگر کفر اختیار کرتی تو یہ بھی ان کی موافقت کرتے۔ بعض وہ تھے جن کے دلوں میں دنیا کی لذتیں اتنی رچی تھیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت کے لیے جگہ نہ رہی تھی۔ ان کے دل پر مال و دولت' حرص' حسد' کینہ جیسی چیزوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ حتیٰ کہ وہ مناجات کی حلاوت اور عبادت کی برکات سے محروم تھے۔ ان میں بعض ایسے تھے جو امور معاش میں اتنے مصروف

۱؎ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِىْٓ اِسْرَآئِيْلَ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِىْ مِنْۢ بَعْدِى اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۔

''اور جب مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا' اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔ میں تصدیق کرتا ہوں ان باتوں کی جو مجھ سے پہلے توریت میں آ چکی ہیں۔ اور خوش خبری دیتا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہو گا۔''

۲؎ قرآن مجید میں کئی مقامات پر حضرت عیسیٰؑ اور دوسرے انبیاء کی تصدیق سے متعلق آیات ہیں (مترجم)

رہتے تھے کہ انھیں آخرت کی تیاری اس کی امید اور اس میں فکر کرنے کی فرصت نہ تھی۔ پھر ان میں بعض وہ لوگ تھے جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے متعلق واہیات شبہات اور بیہودہ خیالات رکھتے تھے۔ تاہم وہ اس درجے کو نہیں پہنچے تھے کہ اسلام کا طوق اپنی گردن سے اتار کر خارج ہو جائیں۔ ان شکوک کا سبب یہ تھا کہ وہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں بشری صفات دیکھتے اور غلبۂ اسلام کو اطراف ممالک میں شاہی غلبہ کے مشابہ سمجھتے تھے۔ انہی میں بعض وہ لوگ تھے جو اپنے قبیلے اور گھرانے سے محبت رکھتے تھے۔ ان کی نصرت، تقویت اور تائید میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے، چاہے اس سے مسلمانوں کو اور اسلام کو نقصان پہنچ جائے۔

نفاق کی یہ دوسری قسم نفاقِ عمل اور نفاقِ اخلاق ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نفاق کی پہلی قسم پر مطلع ہونا ممکن نہیں۔ کیونکہ وہ علم غیب کی ایک قسم ہے۔ دل میں چھپی ہوئی باتوں کا پتا نہیں چل سکتا۔ دوسری قسم کا نفاق اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ خاص کر ہمارے زمانے میں۔ اسی کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے:

ثَلٰثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا۔ اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ۔ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ۔

"تین خصلتیں جس میں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف کرے، اور جب جھگڑا کرے تو بدزبانی کرے۔

هَمُّ الْمُنَافِقِ بَطْنُهٗ وَهَمُّ الْمُؤْمِنِ فَرَسُهٗ۔

منافق اپنے پیٹ کی فکر کرتا ہے اور مومن اپنے گھوڑے کی۔

ایسی اور احادیث ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ عظیم میں ان کے اعمال و اخلاق کھول کھول کر بیان کر دیے ہیں۔ دونوں گروہوں کی کیفیت جگہ جگہ واضح کر دی ہے۔ تاکہ امت ان سے احتراز کرے۔

اگر تم منافقوں کے نمونے دیکھنا چاہو تو امرا کی مجلس میں چلے جاؤ۔ اور ان کے مصاحبین کو دیکھو۔ جو امرا کی مرضی کو شارع کی مرضی پر ترجیح دیتے ہیں۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد براہِ راست سنا اور نفاق کا طریقہ اختیار کیا، اس

میں اور آج کل کے ان لوگوں میں کوئی فرق نہیں جو شارع کے احکام کو بطریقِ یقین جاننے کے باوجود اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اسی طرح منطقی اور فلسفی لوگوں کی وہ جماعت بھی منافق ہے جن کے دلوں میں شکوک وشبہات ہیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے آخرت کے مسئلے ہی کو ختم کر دیا ہے۔

جب تم قرآن پڑھو تو یہ خیال نہ کرو کہ مباحثہ ان لوگوں سے ہوا ہے' جو گزر گئے بلکہ گزشتہ زمانے کی ''بلا'' کے نمونے آج بھی ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔ لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلِكُمْ (ضرور تم اپنے سے اگلے طریقوں کی پیروی کرو گے) پس مقصودِ اصلی ان مفاسد کے کلیات کا بیان ہے' واقعات بطورِ خاص مقصود نہیں۔

اس کتاب میں گمراہ فرقوں کے عقائد کا بیان اور ان کا جواب جو کچھ مجھ سے ہو سکا۔ لکھ دیا ہے۔ آیاتِ مباحثہ کے مضامین کو سمجھنے کے لیے' انشاءاللہ' اتنا ہی کافی ہوگا۔

دوسری فصل

علومِ خمسہ کے مباحث کا بقیّہ

یہ بات جاننا چاہیئے کہ نزولِ قرآن سے مقصد انسانی جماعتوں کی اصلاح و تہذیب ہے۔ وہ جماعتیں عرب کی ہوں یا کسی اور ملک کی۔ وہ شہری ہوں، یا بدوی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ سے تذکیر بآلاء اللہ کے سلسلے میں بنی آدم کے اکثر افراد کی معلومات کا لحاظ رکھا ہے۔ اور بحث و تحقیق میں زیادتی نہیں کی ہے۔ اپنے اسماء وصفات کو ایسے طریقے سے بیان فرمایا ہے جسے عوام کے فطری فہم سمجھ سکیں۔ اور اس کے لیے فلسفۂ الٰہیات اور علمِ کلام کی ضرورت نہ رہے۔ پس ذاتِ باری تعالیٰ کا اثبات قرآن مجید میں بطور اجمال ہے۔ اس لیے کہ تمام افراد بنی آدم کی فطرت میں اس کا علم ہے۔ تم معتدل اور اوسط درجے کے ملکوں میں کسی گروہ کو اللہ کا منکر نہیں پاؤ گے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو حقائق کی تحقیق کے ذریعے ثابت کرنا محال تھا۔ اور پھر یہ بھی بات تھی کہ لوگ صفاتِ الٰہیہ سے مطلع نہ ہوں گے تو ربوبیت کی معرفت بھی حاصل نہ ہوگی جو تہذیب و اصلاحِ نفس کے لیے مفید ترین شے ہے، اس لیئے حکمتِ خداوندی نے انسان کی صفاتِ کاملہ سے اُن صفات کا انتخاب کرلیا جسے سب جانتے اور قابلِ تعریف سمجھتے ہیں۔ پھر ان کو ایسے دقیق معانی کی جگہ استعمال کیا جن کی عظمت کی بلندی تک انسان کی عقل نہیں پہنچ سکتی۔ اس ضمن میں لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (یعنی اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے) کہہ کر جہلِ مرکب کے سخت مرض کے لیے تریاق مہیا کردیا ہے۔ جو بشری صفات اللہ تعالیٰ کے لیے مناسب نہیں تھے، اور جن سے غلط اوہام، باطل عقائد پیدا کر سکتے تھے، وہ ممنوع کر دیے گئے۔ مثلاً بیٹے کا ہونا۔

رونا' بے صبری۔

اگر تم اچھی طرح غور کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ انسان کے لیے یہ تمیز کرنا نہایت مشکل ہے کہ کن صفات کا اثبات بغیر کسی خلل کے ذات باری تعالیٰ کے لیے کیا جا سکتا ہے اور کن صفات سے باطل اوہام پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان باتوں کی تہ کو عوام کے ذہن نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے اس علم (یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے علم) کو توفیقی قرار دے دیا گیا۔ اور اس میں من مانی گفتگو کی اجازت نہیں دی گئی۔

اللہ کی نعمتوں اور اس کی قدرت کی نشانیوں سے متعلق صرف وہی باتیں بیان کی گئی ہیں جنھیں شہری' بدوی' عرب اور غیر عرب سب یکساں طور پر سمجھ سکیں۔ روحانی نعمتوں کا ذکر نہیں کیا گیا جو علمائ اور اولیا کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ان نفع بخش نعمتوں کا بھی بیان نہیں کیا گیا جو بادشاہوں کو خاص طور پر میسر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہی نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے' جن کا ذکر عوام کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ مثلاً آسمان اور زمین کی پیدائش' ابر سے پانی برسانا، چشمے جاری کرنا' بارش کے ذریعے طرح طرح کے پھول' پھل' اور اناج اُگانا' کارآمد صنعتوں کا الہام' اور ان کے چلانے پر قادر ہونا۔ اکثر مقامات میں ہجوم مصائب پر اور ان کے دفع ہونے کے وقت انسان پر مختلف احوال و کیفیات کا ہونا بطور تنبیہ بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ امراضِ نفسانی اکثر انہی سے پیدا ہوتے ہیں۔

ایّام اللہ یعنی وہ واقعات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرماں بردار بندوں کے لیے بطور انعام اور نافرمانوں کے لیے بطور عذاب پیدا کئے۔ ان میں ان واقعات کا انتخاب کیا گیا ہے' جنہیں عوام پہلے ہی سے اجمالاً سنتے آ رہے تھے۔ جیسے قومِ نوح' قومِ عاد اور قومِ ثمود کے قصے کہ انہیں عرب اپنے آباؤ اجداد سے مسلسل سنتے آ رہے تھے۔ اسی طرح ہمارے سردار حضرت ابراہیمؑ اور انبیاءِ بنی اسرائیل کے قصے یہودیوں اور عربوں کے صدہا سال کے اختلاط کی وجہ سے ان کے عوام میں مشہور تھے۔ غیر مانوس قصے، ایرانیوں اور ہندوؤں کے باہمی مقابلوں کے واقعات نہیں بیان کئے گئے۔ مشہور و معروف قصوں میں سے بھی وہی حصے لئے گئے جو سبق آموز ہیں۔ سب قصے پوری تفصیل سے بیان نہیں کئے گئے۔ اس میں حکمت و مصلحت یہ ہے کہ جب عوام عجیب و غریب قصے سنتے ہیں' اور قصے کے تمام پہلو اُن کے سامنے واضح کئے جاتے ہیں' تو نفسِ

قصہ کی طرف ہی ان کا میلان ہوتا ہے، اور سبق آموزی کا مقصدِ اصلی فوت ہو جاتا ہے۔ اسے یوں سمجھ لو جیسے کسی عارف نے کہا ہے کہ جب سے لوگوں نے تجوید کے قواعد سیکھے ہیں قرآن مجید کی خشوع و خضوع کے ساتھ تلاوت کرنے سے محروم ہو گئے ہیں (کیونکہ اس طرح ان کا ذہن حروف کے مخارج اور آواز کے اتار چڑھاؤ کی طرف رہتا ہے معنی مطلب کی طرف نہیں رہتا) اور جب سے مفسرین تفسیر کرنے میں "بعید وجوہ" کی تلاش میں چل پڑے، تب سے علمِ تفسیر ایک ایسی نادر چیز ہوگئی جو نایاب ہو۔

قرآن مجید میں جو قصے بار بار مذکور ہیں وہ یہ ہیں: آدم کی پیدائش زمین سے ان کو ملائکہ کا سجدہ کرنا، شیطان کا سجدے سے انکار کرکے ملعون ہو جانا، اس کے بعد سے بنی آدم کو گمراہ کرنے کی کوشش کرنا، حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت شعیبؑ کا اپنی اپنی قوم سے توحید، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں مباحثے۔ قوموں کا انکار، ان کے لایعنی شبہات، انبیاء کے جوابات، قوموں کا عذابِ الٰہی میں مبتلا ہونا، انبیاء اور ان کے تابعین پر نصرتِ الٰہی کا ظہور۔ حضرت موسیٰؑ، فرعون، اور اہلِ فرعون کا قصہ۔ بنی اسرائیل کے نادانوں کا قصہ، ان کا حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں بڑھ بڑھ کر حجت کرنا، اللہ تعالیٰ کا ان بدبختوں کو سزا دینا، یکے بعد دیگرے اپنے نبی کی مدد کرنا۔ حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کی خلافت کا قصہ، ان کے معجزے اور ان کی کرامتیں۔ حضرت ایوبؑ و حضرت یونسؑ پر مصیبت، پھر ان پر اللہ کی رحمت کا ظہور، حضرت زکریاؑ کی دعا قبول ہونا، حضرت عیسیٰؑ کے عجیب قصے، ان کا بے باپ کے پیدا ہونا۔ گہوارے میں بات کرنا، ان سے معجزات کا ظہور۔ یہ تمام قصے مختلف طرز سے کہیں بطور اختصار اور کہیں بطور تفصیل قرآن کی سورتوں کے اسلوب کے اقتضا کے مطابق بیان ہوئے ہیں۔

جو قصے صرف ایک یا دو بار مذکور ہیں، وہ یہ ہیں: حضرت ادریسؑ کا آسمان پر اٹھایا جانا، حضرت ابراہیمؑ کا مباحثہ نمرود سے۔ پرندوں کو زندہ کرتے دیکھنا۔ اپنے فرزند کو ذبح کرنا۔ حضرت یوسفؑ کا قصہ۔ حضرت موسیٰؑ کی ولادت اور ان کو دریا میں ڈال دینے کا قصہ۔ ان کا ایک قبطی کو قتل کرنا، مدین کی طرف نکل جانا، وہاں نکاح کرنا، درخت پر آگ دیکھنا، اور اس سے کلام سننا۔ گائے کے ذبح کا قصہ۔ موسیٰؑ اور خضر کی ملاقات، طالوت، بلقیس، ذوالقرنین،

اصحابِ کہف کے قصے ۔ دو آدمیوں کا قصہ جو باہم گفتگو کر رہے تھے۔ اصحابِ جنّت کا قصہ۔ حضرت عیسیٰؑ کے تین رسولوں کا قصہ، اور اس مومن کا جسے کافروں نے شہید کر دیا تھا۔ اصحابِ فیل کا قصہ۔

ان تمام قصوں سے مقصود یہ نہیں ہے کہ گزشتہ واقعات کا علم ہو جائے بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ سننے والے کے ذہن میں شرک اور گناہوں کی بُرائی جم جائے۔ اور یہ سمجھ لے کہ کفار پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے' اور مخلص بندے اس کی نصرت وحمایت سے مامون ومحفوظ رہتے ہیں۔

موت اور اس کے بعد کے واقعات کا ذکر اس طرح کیا ہے: موت کی کیفیت' اس وقت انسان کی بے چارگی' موت کے بعد اس کے سامنے جنت اور دوزخ پیش کرنا' عذاب کے فرشتوں کا ظاہر ہونا۔

علاماتِ قیامت میں جو باتیں مذکور ہیں وہ یہ ہیں: حضرت عیسیٰؑ کا نزول' دابۃ الارض کا خروج' یاجوج ماجوج کا خروج' فنا کا صور' حشر ونشر کا صور' سوال وجواب' میزان' اعمال نامے کا دائیں اور بائیں ہاتھ میں ملنا' مومنوں کا جنت میں اور کافروں کا دوزخ میں داخلہ' دوزخ میں پیشواؤں اور ان کے پیرووں کا باہم جھگڑنا' کسی کا انکار کرنا' اور کسی کا دوسرے کو لعنت ملامت کرنا' اہلِ ایمان کا اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہونا۔ انواع واقسام کے عذاب کا ذکر جیسے زنجیر' طوق' گرم کھولتا پانی' خون پیپ کا پانی' تھوہر۔

جنت میں طرح طرح کی نعمتوں کا ذکر: حورانِ بہشتی' محلات' نہریں' مزے مزے کے کھانے' عمدہ لباس' حسین عورتیں' جنتیوں کا باہم ملنا' ملاقات سے تفریح حاصل کرنا' ان تمام امور کو مختلف سورتوں میں کہیں بطور اجمال اور کہیں بطور تفصیل مناسب طرز میں بیان کیا گیا ہے۔

احکام کے مباحث کے سلسلے میں اصل الاصول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملتِ ابراہیمی میں مبعوث ہوئے۔ اس لیے اس ملت کی شریعت کو باقی رکھنا ضروری تھا۔ اس کے اہم مسائل کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہاں تعلیم' فرامین' اور حدود وتعزیرات وغیرہ میں اضافہ ہوا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ عربوں کو پاک کرے اور عرب سارے ملکوں کو پاک کریں' اس

لیے یہ ضروری تھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شریعت کا مواد عربوں کے رسوم و عادات سے لیا جائے۔ اگر تم ملّتِ ابراہیمی کے مجموعی قوانین پر غور کرو، اور عربوں کی رسوم و عادات کا لحاظ رکھو، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت پر نظر کرو جو اصلاح و تکمیل کا درجہ رکھتی ہے، تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ہر حکم کا کوئی سبب اور ہر امر و نہی سے کوئی خاص مصلحت ہے۔ یہاں ان باتوں کی تفصیل طویل ہوگی۔

حاصل یہ کہ ملّتِ ابراہیمی کی عبادات، طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج میں بڑا فتور پیدا ہو گیا تھا۔ ان کو قائم رکھنے کی کسی کو پروا نہ تھی۔ اکثر لوگ ناواقفیت کی بنا پر ان امور میں اختلاف رکھتے تھے۔ اہل جاہلیت نے ان میں تحریف کر دی تھی۔ قرآن عظیم نے اس بدنظمی کو دور کر دیا۔ اور اصلاح و درستی سے صحیح طریقے جاری کر دیے۔

خاندانی معاشرے میں بھی نقصانِ دہ رسوم اور ظلم و سرکشی کا رواج تھا۔ شہریت کا نظام بھی بگڑا ہوا تھا۔ قرآن مجید نے ان کے لیے اصول منضبط کیے اور حد بندی فرمائی۔ اس ضمن میں کئی قسم کے کبائر اور اکثر صغائر کا ذکر فرمایا۔ مسائلِ نماز کا ذکر بطور اجمال کیا۔ اور ''اقامتِ صلوٰۃ'' فرما دیا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان، جماعت، اوقافِ نماز اور بنائے مسجد کی تفصیل فرمائی۔ مسائلِ زکوٰۃ بھی بطور اختصار بیان کیے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تفصیل فرمائی۔ روزے کا بیان سورۂ بقرہ میں، حج کا سورۂ بقرہ اور سورۂ حج میں، جہاد کا سورۂ بقرہ، سورۂ انفال اور دوسرے متفرق مقامات میں، حدود کا سورۂ مائدہ اور سورۂ نور میں، میراث کا سورۂ نساء میں، نکاح و طلاق کا سورۂ بقرہ اور سورۂ طلاق وغیرہ میں کیا گیا ہے۔

جب تم مضامین کی یہ قسم جس کا فائدہ پوری امت کے لیے عام ہے، جان چکے تو اب دوسری قسم کی طرف توجہ کرو، اور وہ یہ ہے کہ کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتا ہے تو آپ جواب دیتے ہیں۔ اہلِ ایمان کسی موقع پر اپنی جان اور مال صرف کرتے، اور منافق بخل کرتے اور نفسانی خواہش کی پیروی کرتے، تو اللہ تعالیٰ مومنوں کی مدح اور منافقین کی مذمت کرتے ہوئے انھیں دھمکاتا۔ اور جب دشمنوں پر فتح ہوتی اور مومن ان کی ایذا سے محفوظ رہتے، تو اللہ تعالیٰ مومنوں پر اپنا احسان جتاتا۔ اسی سلسلے میں وہ مقامات بھی ہیں، جہاں زجر و تنبیہ، یا طنز و اشارے یا امر و نہی کی ضرورت تھی، ان کے لیے مناسب آیات نازل فرمائیں۔

ایسے مقامات پر مفسّر کو چاہیے کہ وہ ان متعلقہ قصوں کو مختصراً بیان کر دے جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ انفال میں واقعۂ بدر کی طرف اشارہ ہے۔ آلِ عمران میں احد کی طرف، احزاب میں غزوۂ خندق کی طرف، سورۂ فتح میں صلح حدیبیہ کی طرف، اور سورۂ حشر میں بنو نضیر کی طرف اشارے ہیں۔ اسی طرح سورۂ برأت میں فتح مکہ اور غزوۂ تبوک کے لیے ابھارا گیا ہے۔ سورۂ مائدہ میں حجۃ الوداع کی طرف، احزاب میں نکاحِ زینبؓ کی طرف، سورۂ تحریم میں تحریم سریہ کی طرف، سورۂ نور میں واقعۂ افک کی طرف، سورۂ جن اور احقاف میں ایک جن کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تلاوتِ قرآن سننے کی طرف، سورۂ برأت میں مسجدِ ضرار کی طرف، اور سورۂ بنی اسرائیل کی ابتدا میں معراج کی طرف اشارے کئے گئے ہیں۔

اگرچہ اس قسم کے مضامین بھی فی الحقیقت تذکیر بایام اللہ میں داخل ہیں۔ لیکن چونکہ ان اشارات کا حل متعلقہ قصص و واقعات جاننے پر موقوف ہے، اس لیے انھیں تمام اقسام سے علیحدہ رکھا گیا۔

☆☆☆

باب دوم

نظمِ قرآن کے معانی مخفی ہونے کے وجوہات

قرآن مجید ٹھیک محاورۂ اہلِ عرب کے مطابق نازل ہوا۔ عرب قدرتی طور اس کے صحیح معنی سمجھ لیتے تھے۔ چنانچہ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب سے متعلق فرمایا:

i- اَلْكِتَابُ الْمُبِيْنُ ''کھول کر بیان کرنے والی کتاب''

ii- قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ''عربی قرآن' تا کہ سمجھ لو''

iii- اُحْكِمَتْ اٰيَاتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ ''اس کی آیتیں محکم ہیں پھران کی تفصیل کی گئی ہے۔''

شارع کی مرضی یہ ہے کہ قرآن کی متشابہ آیات کی تاویل میں' اللہ تعالیٰ کی صفات کی حقیقت کو متصور کرنے میں' اور مبہم امور کی تخصیص اور قصوں کی تفصیل وغیرہ میں غور وخوض نہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات بہت کم کرتے تھے۔ اسی لیے سوالات کم ہی نقل کئے گئے ہیں۔ لیکن جب صحابہ کا دور گزر گیا۔ اور عجمیوں کی مداخلت سے پہلی زبان متروک ہوگئی' تب بعض مقامات پر شارع کی مراد کو سمجھنا دشوار ہوگیا۔ اس لیے لغت اور علمِ نحو کی چھان بین کی حاجت ہوئی۔ سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا' اور تفسیری کتب کی تصنیف کا آغاز ہوا۔ اس وجہ سے ہمیں لازم ہے کہ مشکل مقامات کا اجمالاً ذکر کردیں اور اس کے ساتھ مثالیں بھی پیش کردیں تاکہ غور وخوض کے وقت طول بیانی کی ضرورت نہ رہے۔ اور وہ مقامات خود حل ہو جائیں۔

کسی لفظ کے معنی معلوم نہ ہونے کا سبب اس کا غیر مانوس یا اجنبی ہونا' ہوتا ہے۔ اس کا

علاج یہ ہے کہ اس لفظ کے معنی صحابہؓ، تابعین اور اہلِ معنی سے اخذ کیے جائیں۔

کبھی اس کا سبب ناسخ اور منسوخ کی تمیز نہ کرنے سے ہوتا ہے اور کبھی سبب نزول کے بھول جانے سے، کبھی مضاف اور موصوف وغیرہ کے محذوف ہونے سے کبھی کسی چیز کو کسی چیز سے یا کسی حرف کو کسی اور حرف سے یا اسم کو کسی اور اسم سے یا فعل کو کسی فعل سے یا جمع کو واحد سے اور واحد کو جمع سے، یا غائب کے اسلوب کو مخاطب سے بدل دینے کی وجہ سے اصل مفہوم ذہن میں نہیں آتا۔ اسی طرح کبھی مقدم کے مؤخر ہونے سے یا مؤخر کے مقدم ہونے سے، کبھی ضمائر کے انتشار سے، کبھی ایک لفظ کے متعدد معنی ہونے سے، کبھی تکرار و اطناب سے، کبھی اختصار سے اور بعض وقت کنایہ، اشارہ، متشابہ اور مجازِ عقلی کے سبب سے اصل مطلب مخفی رہتا ہے۔

اس لیے سعادت مند دوستوں کو چاہیے کہ مطلب بیانی سے پہلے ان امور کی حقیقت اور ان کی کچھ مثالوں سے واقف ہو جائیں۔ اور تفصیل کی جگہ رمز و اشارے پر اکتفا کریں۔

پہلی فصل

قرآن کے غیر معروف الفاظ کی شرح

قرآن کے غیر معروف الفاظ کی بہترین شرح ترجمانِ قرآن حضرت عبداللہ ابن عباس کی ہے، جو ابن ابی طلحہؒ کے ذریعے صحیح طور پر ہم تک پہنچی ہے اور غالباً امام بخاری نے بھی صحیح بخاری میں اسے صحیح مانا ہے۔ اس کے بعد ابن عباسؓ سے ضحاک کے ذریعے جو روایات ہیں۔ پھر نافع بن الارزق کے سوالات پر ابن عباسؓ کے جوابات ہیں۔ ان تین ذرائع کا ذکر علامہ سیوطی نے اپنی کتاب ''اتقان'' میں کیا ہے۔

اس کے بعد امام بخاری نے ائمۂ تفسیر سے جو شرح نقل کی ہے، اس کا مرتبہ ہے۔ پھر وہ شرحیں ہیں جنہیں دوسرے مفسرین نے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین سے روایت کی ہیں۔ میں اس کتاب کے پانچویں باب میں ''غرائبِ قرآن'' کی تمام معتبر شرحوں کو مع شانِ نزول مرتب کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔ وہ باب ایک مستقل رسالہ ہوگا۔ جو چاہے اسے اس کتاب میں شامل کر لے، اور جو چاہے اسے علیحدہ رکھے۔

وَلِلنَّاسِ فِيْمَا يَعْشِقُوْنَ مَذَاهِبُ.

''اور لوگ جس طریقے کو پسند کریں وہی ان کا مذہب ہے''۔

یہاں یہ جان لینا چاہئے کہ صحابہ اور تابعین اکثر کسی لفظ کی تفسیر اس کے لازم معنی سے کرتے ہیں۔ اور متاخرین لغات کے تتبع اور مواقع کی تلاش میں قدیم تفسیر کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ ہماری غرض اس کتاب میں سلف کی تفسیروں کی پیروی ہے تنقیح و تنقید کے لیے اس کے علاوہ دوسرا موقع ہے۔

دوسری فصل

ناسخ ومنسوخ

فنِ تفسیر کا میدان بہت وسیع ہے۔ اس کے مشکل مقامات میں ایک ناسخ ومنسوخ کی شناخت ہے۔ جس میں بہت سے اختلافات ہیں۔ دشواری کا سب سے بڑا سبب متقدمین اور متاخرین کی اصطلاح کا اختلاف ہے۔ اس بارے میں صحابہ اور تابعین کے کلام سے جو کچھ اخذ کیا جاسکتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ ''نسخ'' کو اس کے لغوی معنی میں استعمال کرتے تھے (یعنی ایک چیز کو ہٹا کر دوسری چیز لانا) نہ کہ اہلِ اصول کے اصطلاحی معنی میں کہ اُن کے نزدیک ایک آیت کے بعض اوصاف کا ازالہ کسی دوسری آیت سے کرنا نسخ ہے۔ یہ ازالہٴ اوصافِ عام ہے، اس کا تعلق چاہے مدتِ عمل کی انتہا سے ہو، یا کلام کو اس کے متبادر معنی سے غیر متبادر معنی کی طرف پھیرنے سے۔ یا کہیں یہ بتا دیا کہ ''اتفاق سے یہ قید لگا دی گئی تھی۔'' کبھی عام کو خاص کر دیا۔ یا قرآن کی کسی صریح آیت اور بظاہر قیاس کیے ہوئے مسئلے کے درمیان فرق بتانے کے لیے یا زمانۂ جاہلیت کی عادت وشریعتِ سابقہ کا ازالہ کرنے کے لیے ایسا کیا جاتا ہے۔

اس طرح ان کے نزدیک نسخ کا میدان وسیع ہے۔ جہاں عقل کی جولانی کے لیے بہت موقع ہے۔ اور اس لیے اختلاف کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا۔ اور منسوخ آیات کی تعداد پانچ سو تک پہنچ گئی۔ لیکن اس طرح غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی تعداد غیر محدود ہے۔ مگر متاخرین کی اصطلاح کی رو سے منسوخ آیات کم تعداد قلیل ہے۔ بالخصوص اُس توجیہ کے اعتبار سے جو ہم نے اختیار کی ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے ''اتقان'' میں بعض علماء کے اقوال لے کر اس پر بسیط مضمون لکھا ہے۔ جو آیتیں متاخرین کی رائے میں منسوخ ہیں، انھیں شیخ محی الدین ابن

عربی کی موافقت میں تحریر کی ہیں۔ اور تقریباً بیس منسوخ آیتیں شمار کی ہیں۔ لیکن اس فقیر کو ان بیس میں سے اکثر کے متعلق تامّل ہے۔ چنانچہ ہم یہاں علامہ سیوطی کی رائیں نقل کر کے اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔

۱۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ. (۲:۱۸۰)

''فرض کیا گیا تم پر یہ کہ جب آئے تم میں سے کسی کو موت..........''

یہ آیت منسوخ ہے۔ اس کے ناسخ کے متعلق اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ آیت میراث اس کی ناسخ ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ حدیث لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ (یعنی وارث کے لیے وصیت کی ضرورت نہیں) سے منسوخ ہے۔ اور بعض کا قول ہے کہ اجماع سے موقوف ہے۔ یہ ابنِ عربی نے بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ .... ''اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے تمہاری اولاد کے بارے میں..........'' والی آیت سے یہ منسوخ ہے۔ اور حدیث: لَا وَصِيَّةَ...... اس نسخ کو بیان کرتی ہے۔[۱]

۲۔ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ .... (۲:۱۸۴)

''اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہیں ان پر فدیہ ہے''..........

اس آیت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ. (پس جو دیکھے تم میں سے اس مہینے کو تو اس میں روزہ رکھے) سے منسوخ ہو گئی۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ آیت محکم ہے اور اس میں ''لا'' چھپا ہوا۔

میں کہتا ہوں کہ میرے نزدیک آیت کے یہ معنی ہیں:

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَ الطَّعَامَ فِدْيَةٌ هِىَ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ.

''جو لوگ کھانا دینے کی طاقت رکھتے ہیں ان پر فدیہ ہے جو ایک مسکین کا کھانا ہے۔

۱۔ حقیقت یہ ہے کہ آیت مذکورۃ الصدر کا حکم اس وقت دیا گیا تھا جب کہ وراثت کی تقسیم کا قانون مقرر نہیں ہوا تھا۔ بعد میں تقسیم وراثت کا ضابطہ بنا' تو اس پر عمل لازم ہو گیا۔

یہاں ضمیر کا اس کے مرجع سے پہلے اس لیے ذکر کیا کہ مرجع باعتبار رتبہ کے مقدم ہے۔ اور ضمیر کو مذکر اس لیئے لایا گیا کہ درحقیقت فدیہ سے مراد طعام ہی ہے۔ اور طعام سے مُراد صدقہ فطر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں روزے کے حکم کے بعد صدقہ فطر کا بیان اس طرح کیا ہے جیسے فَمَنْ شَهِدَمِنْكُمُ .... کے بعد وَلِتُكَبِّرُ اللّٰهَ عَلٰى مَاهَدٰكُمْ '' اور تا کہ تم تکبیر کرو اللہ کی اس طریقے پر جو تمہیں بتایا ہے'' فرما کر عید کی تکبیروں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۳۔ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ. (۲:۱۸۷)

''حلال کر دیا گیا تمہارے لیے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا۔''

اس آیت نے '' كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ '' جیسے فرض کیا تھا ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے'' کو منسوخ کر دیا۔ کیونکہ تشبیہ دینے سے مطلب یہ ہے کہ شب میں بھی کھانے پینے اور وطی کرنے کی حرمت اگلی امتوں کی طرح باقی رہے۔

یہ ابن عربی نے لکھا ہے۔ اور اس کے علاوہ یہ بھی بیان کیا ہے کہ اسے سنت نے منسوخ کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ '' كَمَا كُتِبَ '' سے مقصود صرف روزوں کے فرض ہونے کی تشبیہ دینا ہے۔ نسخ مقصود نہیں۔ کیونکہ یہاں روزہ داروں کی اس روش کو تبدیل کیا ہے جو اس اجازت سے پہلے تھی۔ ہمارے پاس یہ ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وطی کو حرام کر دیا تھا۔ اگر اسے مان بھی لیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سنّت سے ثابت ہے۔

۴۔ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ. قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ (۲:۲۱۷)

''لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں ماہِ حرام میں جنگ کے بارے میں۔ کہہ دے اس میں جنگ کرنا بڑا گناہ ہے......''

اس آیت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ذیل کی آیت نے اسے منسوخ کر دیا ہے:

قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً (۹:۳۶)

''تم سب کے سب مشرکوں سے جنگ کرو''۔

اس روایتِ نسخ کو ابن جریر نے نقل کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ آیت مشرکین سے جنگ کرنے کی حرمت نہیں بتاتی۔ بلکہ اس کے

جائز ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ یہ آیت اس قسم کی آیتوں میں سے ہے جن میں حکم کے سبب کو مان کر اس کے موانع بھی ظاہر کیے گئے ہیں۔ چنانچہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ''اگرچہ ماہِ حرام میں جنگ کرنا برا ہے، مگر کفر و شرک کا فتنہ اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ اس لیے اس کے انسداد کے لیے جنگ جائز ہے۔'' یہ مطلب اللہ کے کلام کے سیاق سے ظاہر ہے۔

۵۔ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ. (۲: ۲۴۰)

''اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑیں (انھیں چاہیئے کہ) وصیت کر جائیں اپنی بیویوں کے لیے ایک سال تک ضروری اخراجات کی اور گھر سے نہ نکالنے کی۔''

یہ آیت ذیل کی آیت میں اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا (چار مہینے اور دس دن) کی وجہ سے منسوخ ہے:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (۲: ۲۳۴)

''اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، تو وہ بیویاں چار مہینے اور دس دن اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں (یعنی ٹھہری رہیں)''

کہتے ہیں کہ نسخ وصیت والی آیت سے ہوا۔ اور ''گھر میں ٹھہرنا'' ایک حدیث کی وجہ سے منسوخ ہوا، جس میں ''لَا سُكْنٰى'' کا لفظ آتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس آیت کے معنی یوں کیے جائیں کہ میّت کے لیے تو وصیّت جائز ہے (کہ ایک سال کا نان و نفقہ بیوی کو دیا جائے اور گھر سے نہ نکالا جائے) مگر عورت پر زمانۂ وصیّت (یعنی ایک سال) تک گھر میں رہنا واجب نہیں (صرف چار مہینے دس دن گزارے) یہی حضرت ابن عباسؓ کا مذہب ہے۔ اور آیت سے بھی ظاہر ہے۔

۶۔ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ.......... (۲: ۲۸۴)

''اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا اسے چھپاؤ اللہ اس پر محاسبہ کرے گا۔''

کہا جاتا ہے کہ یہ آیت لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ''اللہ کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کے مقدور کے مطابق'' سے منسوخ ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ تخصیص بطور عام ہے۔ مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ''جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے'' سے مراد اخلاص و نفاق ہے نہ کہ دل کے وسوسے جن پر انسان کا اختیار نہیں۔ کیونکہ شرعی تکلیف انہی امور میں دی گئی ہے جن پر انسان کو قدرت حاصل ہے۔

سورۂ آل عمران:

اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ. "اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے"۔

اس کے بارے میں دو قول ہیں۔ ایک تو یہ کہ فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ''یعنی پس تم اللہ سے ڈرو جس قدر تم سے ہو سکے'' سے منسوخ ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں بلکہ محکم آیت ہے آل عمران میں اس کے سوا اور کوئی آیت نہیں جس سے اس کا نسخ ہونا صحیح ہو۔

میں کہتا ہوں کہ حَقَّ تُقَاتِہٖ ''اس کے ڈرنے کا حق'' سے مراد شرک اور کفر سے بچنا ہے۔ اور مَا اسْتَطَعْتُمْ ''جس قدر تم سے ہو سکے'' میں اعمال کی مقدرت مراد ہے۔ یعنی جو وضو نہ کر سکتا ہو وہ تیمم کر لے۔ اور قیام کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھ لے۔

اس کے بعد ہی آتا ہے:

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ.

''اور تم ہرگز نہ مرو مگر ایسے حال میں کہ تم مسلم ہو۔ اس سے مطلب صاف اور واضح ہے۔

سورۂ نساء:

وَالَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ فَاٰتُوْھُمْ نَصِیْبَھُمْ.

''جن لوگوں سے تمہارا عہد و پیمان ہو تو ان کو ان کا حصہ دو۔''

یہ آیت ذیل کی آیت سے منسوخ ہے:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُھُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ.

''اور بعض رشتے والے بعض سے زیادہ حق دار ہیں۔''

میں کہتا ہوں کہ آیت کے صاف اور واضح معنی یہ ہیں کہ میراث حق داروں کے لیے ہے۔اور صلۂ نیک ان لوگوں کے لیے ہے جن سے زندگی بھر محبت کے تعلقات رہے ہوں۔[1]

۲۔ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا○

''جب تقسیم کے وقت قرابت والے' یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان کے ساتھ نرم بات کرو''۔

اس آیت میں تین قول ہیں۔ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، دوسرا یہ کہ منسوخ نہیں ہے۔مگر لوگ اس پر عمل کرنے میں سستی کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت محکم ہے۔اس میں ایک مستحب (یا پسندیدہ) عمل کی تحریک کی گئی ہے۔یہی مطلب واضح ہے۔

۳۔ وَالّٰتِىْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِى الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا.

''تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان پر چار گواہ طلب کرو اگر وہ گواہی دے دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں بند کرو یہاں تک کہ انھیں موت آ جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ پیدا کر دے۔''

کہتے ہیں کہ یہ آیت سورۂ نور کی آیت سے منسوخ ہے۔[2]

---

[1] تاریخ اسلام شاہد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار اور مہاجرین میں رشتۂ اخوت قائم کیا تھا۔ انصار نے اس کی تعمیل اس طرح کی کہ اب تک اس کی مثال نہیں ملتی۔خطرہ تھا کہ اس طرح میراث میں بھی ان منہ بولے بھائیوں کا حصہ رکھا جائے گا' اس لیے دوسری آیت کے ذریعے اس سے روک دیا گیا۔(مترجم)

[2] سورۂ نور کی آیت یہ ہے

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِىْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ.

''زانی مرد اور زانیہ عورت میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔''

میں کہتا ہوں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ یہ حکم اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راہ کی تفصیل فرما دی جس کا آیت میں وعدہ کیا گیا ہے۔

سورۂ مائدہ:

وَلاَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ............ [1]

کہا جاتا ہے کہ یہ آیت اس لیے منسوخ ہے کہ حرمت والے مہینوں میں قتل کو مباح کر دیا گیا۔

میں کہتا ہوں کہ اس آیت کی ناسخ قرآن مجید کی کوئی آیت نہیں ہے۔ اور نہ کوئی صحیح حدیث ایسی ہے۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو قتال حرام ہے وہ حرمت کے مہینوں میں زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبے میں فرمایا کہ تمہاری جان، مال اور آبرو تم پر اسی طرح حرام ہے جس طرح آج کا دن، یہ مہینہ اور یہ شہر حرمت والے ہیں۔

۲۔ فَإِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ.

"پس اگر وہ (یہودی) آئیں تیرے پاس (مقدمہ لے کر) تو فیصلہ کر ان کے درمیان یا ان سے اعراض کر (اختیار ہے)"

کہا جاتا ہے کہ یہ آیت ذیل کی آیت سے منسوخ ہے:

وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ. (۵:۴۹)

"اور یہ کہ تو ان کے درمیان فیصلہ کر اس ذریعے سے جو اللہ نے نازل کیا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تجھے فیصلہ کرنا منظور ہو تو اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ کر دے۔ اور ان کی خواہش کی پیروی نہ کر۔ پس ہمارے لیے دونوں

---

[1] آیت شریف یہ ہے:

لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا..............

"نہ حلال کرو (یعنی بے حرمت نہ کرو) اللہ کی نشانیوں کو اور نہ حرمت والے مہینے کو نہ قربانی کے جانور کو نہ نذر ومنت کے طوق والے جانور کو اور نہ ان لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور خوشنودی کی تلاش کرتے ہوئے کعبے کی طرف جا رہے ہوں۔

باتیں جائز ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو غیر مسلم کو اجازت دے دیں کہ وہ اپنے مقدمات اپنے سرداروں کے سامنے پیش کریں۔ تاکہ وہ اپنی شریعت کے مطابق فیصلہ کریں۔ اور اگر وہ چاہیں تو ہم ان کا فیصلہ کر دیں، مگر اس صورت میں ہم اللہ کے بنائے ہوئے قانون پر عمل کریں گے۔

۳۔ اَوْ اٰخَرَانِ مِنْ غَیْرِکُمْ. (یا دوسرے دو تمہارے غیر میں سے) یہ منسوخ ہے۔ ناسخ وہ آیت ہے جس میں وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ ہے ''اور گواہ رکھو تم میں سے دو عدل والوں کی) [1]

میں کہتا ہوں کہ امام احمد کا قول ظاہر معنی کے مطابق ہے۔ دوسرے اماموں کے نزدیک اٰخَرَانِ مِنْ غَیْرِکُمْ کے معنی اٰخَرَانِ مِنْ غَیْرِ اَقَارِبِکُمْ ہے۔ اس لحاظ سے گواہ مسلمان قرابت داروں میں سے ہوں گے۔

سورۂ انفال:

اَنْ یَّکُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ......

---

[1] دونوں آیتیں یہ ہیں:

۱۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِیْنَ الْوَصِیَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِیْبَةُ الْمَوْتِ......

''اے ایمان والو! تمہارے درمیان شہادت ہو جب کہ تم میں سے کسی کو موت آئے، وصیت کے وقت دو عدل والوں کی تم میں سے یا دوسرے دو تمہارے غیر میں سے اگر تم سفر میں ہو اور موت کی مصیبت تم پر آ پہنچے۔'' (۵:۱۰۶)

۲۔ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ.

''پس جب وہ عورتیں پہنچیں اپنی مقررہ مدت کو تو انہیں اچھے طریقے سے روک رکھو یا انہیں جدا کر دو اچھے طریقے سے اور گواہ رکھو دو عدل والوں کو تم میں سے اور تم شہادت کو قائم کرو اللہ کے لیے۔'' ۲

پہلی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان گواہ بننے کے لیے موجود نہ ہو تب غیر مسلم کو گواہ بنایا جائے۔ دوسری آیت میں طلاق و مراجعت کے سلسلے میں گواہی کا قانون بتایا گیا ہے۔ لہٰذا ناسخ و منسوخ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (مترجم)

اس آیت کے بعد جو آیت آتی ہے، اس سے یہ آیت منسوخ ہے۔

میں کہتا ہوں۔ ہاں منسوخ ہے۔[۱]

سورۂ براءت:

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا ''نکل پڑو ہلکے اور بوجھل'' منسوخ ہے۔ دو عذر والی آیتوں سے: (۱) لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ...... ''یعنی اندھے پر کوئی مضائقہ نہیں''

(۲) لَیْسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ......

میں کہتا ہوں کہ خِفَافًا ''ہلکے ہوکر'' کا مطلب یہ ہے کہ جنگ یا جہاد کا ضروری ساز و سامان مثلاً سواری کے جانور، نوکر چاکر، کھانے پینے کی چیزیں بہت ہی کم ہوں اور اس کے برخلاف ثِقَالًا سے مراد ان چیزوں کی افراط ہے۔ لہٰذا نسخ نہیں ہو سکتا۔[۲]

سورۂ نور:

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً. ''زانی مرد نہیں تعلق پیدا کرتا مگر زانیہ عورت سے''

۱۔ پوری آیت شریفہ یہ ہے:

اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ یَّغْلِبُوْا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ ۝ (۸: ۶۵)

''اگر تم میں بیس صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر تم میں سو ہوں تو وہ ہزار کافروں پر غالب ہوں گے اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ سے کام نہیں لیتے۔''

اس کے بعد کی آیت یہ ہے:

اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنْکُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِیْکُمْ ضَعْفًا ط فَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ اَلْفٌ یَّغْلِبُوْآ اَلْفَیْنِ بِاِذْنِ اللّٰہِ

''اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا اور جانتا ہے کہ تم میں کمزوری ہے۔ پس اگر تم میں سو صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر ہزار ہوں تو وہ ہزار پر غالب ہوں گے اللہ کے حکم سے۔''

دونوں آیتوں کا مضمون اپنی اپنی جگہ ہے۔ ناسخ و منسوخ کا ان میں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ (مترجم)

۲۔ اِنْفِرُوْا والی آیت سورۂ توبہ کی آیت ۴۱ ہے۔

لَیْسَ والی آیت بھی سورۂ توبہ والی آیت ۹۱ ہے اس میں معذور لوگوں کا ذکر ہے۔

یہ آیت وَانْكِحُوا الْاَیَامٰی مِنْكُمْ ''تم میں سے جو مجرد ہیں ان کے نکاح کر دو'' سے منسوخ ہے۔

میں کہتا ہوں کہ امام احمد اس کے ظاہری معنی بیان کرتے ہیں۔ اور دوسرے ائمہ کے نزدیک یہ معنی ہیں کہ گناہ کبیرہ کا جو مرتکب ہو وہ زانیہ ہی کے کفو میں ہے۔ یا یہ کہ زانیہ سے نکاح کرنا پسندیدہ (مستحب) نہیں ہے۔ اور حُرِّمَ ذٰلِكَ ''حرام کیا گیا ہے وہ'' سے اشارہ زنا اور شرک کی طرف ہے۔ اس لیے نسخ نہیں ہے۔[1]

۲۔ لِيَسْتَأْذِنْكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ...... (۲۴:۵۸)

''چاہئے کہ اجازت لیں تم سے وہ جو تمہارے مملوک ہیں (یعنی لونڈی غلام)......''

کہا جاتا ہے کہ یہ منسوخ ہے۔ اور بعض کہتے ہیں منسوخ نہیں ہے لیکن لوگ اس پر عمل کرنے کی پروا نہیں کرتے۔ میں کہتا ہوں کہ ابن عباسؓ کے مذہب میں یہ منسوخ نہیں ہے۔ اور یہی فیصلہ قابلِ اعتماد ہے۔

سورۂ احزاب: لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ...... (۳۳ : ۵۲) ''اس کے بعد تیرے لیے عورتیں حلال نہیں ہیں) یہ آیت منسوخ ہے، اور اس کی ناسخ یہ آیت ہے:

اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْ............ (۳۳ : ۵۰)

''ہم نے حلال کر دیا تیرے لیے تیری بیویوں کو جو''............

میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے ناسخ آیت باعتبارِ تلاوت منسوخ سے مقدم ہو۔ اور میرے نزدیک یہی بات ظاہر ہے۔[2]

---

[1] یہ سورۂ النور کی تیسری آیت ہے۔ نکاح کے معنی وطی کے بھی ہیں۔ یہاں دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زنا بہت ہی قبیح فعل ہے۔ جو اس کا مرتکب ہو اس کے لیے زانیہ اور مشرکہ ہی موزوں ہیں۔ مومن کے لیے یہ دونوں حرام ہیں۔ اس کے نکاح کے لیے مومنہ ہی موزوں ہے۔

[2] دونوں آیات شریفہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات سے متعلق ہیں۔ دوسری آیت میں (جسے ناسخ بتایا گیا ہے) کہ ''جن بیویوں کا تم نے مہر ادا کیا ہے وہ تمہارے لیے حلال ہیں۔'' جب چار بیویوں کی حد تک رکھنے کا حکم نازل ہوا تو جن مومنوں کے پاس اس سے زیادہ بیویاں تھیں انھیں باقی کو چھوڑ دینا پڑا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی کہ جتنی ہیں وہ رہیں۔ اس سے غرض عورتوں میں ''احکامِ دین'' کی تعلیم و تبلیغ و اشاعت تھی۔ سیرت پاک شاہد ہے کہ ۵۳ سال کی عمر تک آپ کی ایک ہی بیوی (حضرت خدیجہؓ) تھیں۔ بڑھاپے میں بھی آپ ایک ہی پر اکتفا کر سکتے تھے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ کیوں؟ اس لیے کہ احکام دین کی اشاعت، اسلام کی تبلیغ اور غیر مسلموں کے تالیفِ قلوب کی مصلحتیں تھیں۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سورۂ مجادلہ:

اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا (۵۸: ۱۲) ''جب تم رسول سے مشورہ کرو تو پیش کرو......''

یہ آیت بعد میں آنے والی آیت سے منسوخ ہے۔ میں کہتا ہوں یہ بات ٹھیک ہے۔[1]

سورۂ ممتحنہ:

فَاٰتُوا الَّذِیْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا...... (۶۰: ۱۱)

''پس تم دو ان لوگوں کو جن کی بیویاں چلی گئی ہیں مثل اس کے جو انہوں نے خرچ کیا ہے'' اس آیت کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت سیف سے منسوخ ہے۔

(پچھلے صفحہ سے بقیہ حاشیہ) جس آیت کو منسوخ قرار دیا گیا ہے، حقیقت واضح ہو جانے کے بعد اسے منسوخ نہیں کہا جا سکتا۔ اس سے صرف حد بندی کا پتا چلتا ہے۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں نو بیویاں تھیں اور ماریہ کو شامل کر کے تعداد دس ہو جاتی ہے۔ اس آیت میں ''مِنْ بَعْدُ'' فرما کر تعداد بڑھانے سے روک دیا گیا ہے۔ کیونکہ دینی غرض کے لیے اتنی کافی سمجھی گئیں۔ (مترجم)

[1] دونوں آیتیں یہ ہیں:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ۭ ذٰلِكَ خَیْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

''اے ایمان والو! جب تم رسول سے مشورہ کرو تو اپنے مشورے سے پہلے صدقہ دے لیا کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور بہت پاکیزہ ہے۔ اور اگر تم نہ پاؤ (صدقہ کی چیز) تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

اس کے بعد کی آیت یہ ہے:

ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۭ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔

''کیا تم ڈر گئے کہ اپنے مشورے سے پہلے صدقہ دیا کرو؟ پس جب تم ایسا نہ کرو اور اللہ نے تم کو معاف کر دیا ہے تو تم نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

دونوں آیتوں میں تضاد نہیں ہے۔ پہلی آیت میں صدقہ دینے کے حکم کے ساتھ ہی فرما دیا گیا کہ اگر تم نہ پاؤ...... اور دوسری آیت میں بھی یہی بتایا کہ اگر تم ایسا نہ کرو تو مؤاخذہ نہیں۔ اس لیے ناسخ و منسوخ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آیت غنیمت سے منسوخ ہے۔اور تیسرا قول یہ ہے کہ محکم ہے۔
میں کہتا ہوں اس کا محکم ہونا بہت ظاہر ہے۔لیکن یہ حکم صلح اور قوتِ کفار کے موقع کے لیے خاص ہے۔

سورۂ مزمل:

قُمِ اللَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا...... ''اُٹھ رات میں مگر تھوڑی دیر)

کہا جاتا ہے کہ یہ حکم اسی سورت کی آخری آیتوں سے منسوخ ہے۔اور پھر وہ بھی پانچ وقتوں کی نماز فرض ہونے کے بعد منسوخ ہو گئی۔

میں کہتا ہوں کہ سورۂ مزمل کے شروع میں رات کو اٹھ کر عبادت کرنے کی تاکید بطور مستحب ہے اور آخر میں صرف اس تاکید کو منسوخ کر کے مستحب ''بے تاکید'' کر دیا ۔

علامہ سیوطی نے ابن عربی کے ساتھ متفق ہو کر کہا ہے کہ انیس آیتیں منسوخ ہیں۔ حالانکہ ان میں بھی بعض کی نسبت اختلافات ہیں۔ان کے علاوہ کسی آیت سے متعلق منسوخ ہونے کا دعویٰ صحیح نہیں۔آیت استیذان (اجازت مانگنا) آیتِ قسمت (تقسیم وراثت) اور آیاتِ احکام منسوخ نہیں۔اب رہ گئیں انیس آیتیں۔تو میں کہتا ہوں کہ ہماری تحریر کے مطابق صرف پانچ ہی آیات ہیں جو نسخ کے لیے متعین کی جا سکتی ہیں۔

فصل سوم

اسبابِ نزول

دشوار مقامات میں سے اسبابِ نزول کا مسئلہ بھی ہے۔ اس کا سبب بھی متقدمین اور متاخرین کی اصطلاحات کا اختلاف ہے۔ صحابہ اور تابعین کے بیانات سے جو نتیجہ نکالا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ حضرات جہاں یہ کہتے ہیں: نَزَلَتْ فِيْ كَذَا (یعنی یہ آیت فلاں بارے میں نازل ہوئی) تو یہ کسی خاص واقعہ سے مخصوص نہیں ہوتا، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانے میں ہوا، اور نزولِ آیت کا سبب بنا۔

ان حضرات کی یہ عادت تھی کہ وہ ایسے مواقع کا جو آنحضرت ﷺ کے زمانے میں یا اس کے بعد آئے ہوں، ذکر کرتے تو کہہ دیا کرتے کہ یہ آیت ایسے موقع پر نازل ہوئی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ آیت پوری طرح اسی واقعہ پر منطبق ہو، بلکہ اسے اصل حکم پر منطبق ہونا چاہیے۔

کبھی ایسا بھی ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانے میں کوئی واقعہ ہوا، اور صحابہؓ نے اس کا حکم کسی آیت سے اخذ فرما کر موقع پر تلاوت کر دی۔ ایسے واقعات کو بھی بیان کرتے وقت صحابہ نَزَلَتْ فِي كَذَا کہہ دیا کرتے۔ اور کبھی کہتے فَاَنْزَلَ اللّٰهُ قَوْلَهُ كَذَا (یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا حکم اس طرح نازل فرمایا) اس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت سے استنباط، اور اس وقت قلبِ مبارک پر جو کچھ القا ہوا وہ بھی وحی اور نَفَثَ فِي الرُّوْع[1] کی ایک قسم ہے۔ اس لیے ایسے موقع پر فَاُنْزِلَتْ (پس اتاری گئی) کہنا جائز ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص اسے ''تکرارِ نزول'' سے تعبیر کر لے۔

---

[1] نَفَثَ فِي الرُّوْع (دل میں پھونکنا) اصطلاح میں وہ بات جو اللہ کی طرف سے دل میں اترے۔

محدثین قرآنی آیات کے ذیل میں بہت سی ایسی چیزوں کا ذکر کر دیتے ہیں جو درحقیقت سببِ نزول نہیں ہوتیں۔ مثلاً صحابہؓ کا اپنے مباحثے میں کسی آیت کو بطور شہادت پیش کرنا یا کسی آیت سے مثال دینا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت سے اپنی بات کو ثابت کرنا یا ایسی حدیث روایت کرنا جو اصل مطلب کی آیت کی موافقت میں ہو' یا نزول آیت کے موقع کا تعین کرنا' یا جو اسماء آیت میں بطور مبہم مذکور ہوں ان کا تعین کرنا یا کسی قرآنی کلمہ کا تلفظ کرنا یا قرآنی سورتوں اور آیتوں کے فضائل بیان کرنا یا امر قرآنی کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح تعمیل کی اس کی شکل بتانا۔ اس قسم کی ساری باتیں درحقیقت اسبابِ نزول میں شامل نہیں ہیں اور نہ ان باتوں کا احاطہ کرنا مفسر کے لیے ضروری ہے مفسر کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ جن قصص و واقعات کے اشارے قرآنی آیات میں آتے ہیں ان کا علم ہو۔ کیونکہ آیات کے اشارے کا سمجھنا واقعات کے علم کے بغیر ممکن نہیں۔

دوسرے' اسے قصے کے وہ اجزا بھی جاننے چاہییں جن سے عام باتوں کی تخصیص ہوتی ہے' یا کوئی اور فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً کلام کو اس کے ظاہری معنی سے پھیرنے کے وجوہ کو جاننا۔ کیونکہ اس کے بغیر آیات کے اصل مقصد کو سمجھنا ممکن نہیں۔

یہ جان لینا چاہیئے کہ حدیث میں انبیاء کے قصے کم بیان ہوئے ہیں۔ جو لمبے چوڑے قصے مفسرین بیان کرتے ہیں' وہ اہل کتاب کے علماء سے منقول ہیں (اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰہُ) صحیح بخاری میں مرفوعاً روایت کی گئی ہے کہ لَاتُصَدِّقُوْٓا اَھْلَ الْکِتَابِ وَلَاتُکَذِّبُوْھُمْ ''تم اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب۔'' صحابہ اور تابعین مشرکین اور یہود کے مذاہب اور ان کی جاہلانہ عادات کے جو قصے بیان کرتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ عقائد و عادات واضح ہو جائیں۔ ایسے موقعوں پر وہ کہہ دیا کرتے ہیں: نَزَلَتِ الْاٰیَۃُ فِیْ کَذَا (یعنی اس کے بارے میں آیت اس طرح نازل ہوئی) اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آیت ''اس طرح'' کے واقعات سے متعلق اتری۔ ایسا کہنے سے ان کی مراد عام ہوتی ہے۔ خواہ سببِ نزول وہی واقعہ ہو یا اسی طرح کا کوئی اور واقعہ' یا آیت اس کے قریب ہی نازل ہوئی ہو۔ خاص موقع ظاہر کرنے سے ان کا مقصد اس کی تخصیص کا اظہار نہیں ہوتا۔ صرف یہ غرض ہوتی

ہے کہ یہ صورت ان امور کلیہ کے لیے ایک اچھی مثال ہے۔ اس ضمن میں اکثر اوقات ان کے اقوال میں باہم اختلاف ہوتا ہے۔ اور ہر ایک کی بات ایک جانب کو جھکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، مگر اصل میں یہ سب کے مطالبات متحد ہوتے ہیں۔ حضرت ابو الدردا (رضی اللہ عنہ) نے اسی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ کوئی شخص فقیہ نہیں ہو سکتا جب تک اس میں ایک آیت کو متعدد مواقع پر اطلاق کرنے کا ملکہ پیدا نہ ہو جائے۔

اسی بنا پر قرآنِ عظیم میں یہ اسلوب بکثرت اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک سعید کی۔ اس کے تحت بعض اوصاف سعادت بیان کئے گئے ہیں۔ اور ایک شقی کی، جس کے تحت بعض اوصافِ شقاوت مذکور ہیں۔ اس سے غرض عام طور پر ان اوصاف و اعمال کے احکام کا بیان ہے، کسی خاص شخص کی طرف تعریض یا اشارہ مقصود نہیں ہوتا۔

۱۔ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ط حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا. (۴۶: ۱۵)

"ہم نے نصیحت کی انسان کو اس کے والدین کے ساتھ احسان کرنے کی۔ اس کی ماں نے اسے پیٹ میں تکلیف سے اٹھایا۔ اور اسے تکلیف سے پیدا کیا۔"

اس کے بعد شقی اور سعید کی دونوں صورتیں بیان فرمائیں۔

۲۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ مَاذَآ أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوٓا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ. (۱۶: ۲۵)

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا اتارا تو وہ کہتے ہیں اگلے لوگوں کی کہانیاں۔"

۳۔ وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَا ذَآ أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا خَيْرًا. (۱۶: ۳۰)

"اور تقویٰ والوں سے کہا جاتا ہے کہ کیا اتارا تمہارے رب نے؟ تو وہ کہتے ہیں بھلائی (یا نیکی)۔"

اسی طرح ذیل کی آیتوں کے بارے میں خیال کرنا چاہیے:

۱۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً (۱۶: ۱۱۲)

"اللہ ایک ایسی بستی کی مثال بیان کرتا ہے وہ بستی امن اور اطمینان کی حالت میں تھی۔"

۲۔ هُوَالَّذِی خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْکُنَ اِلَیْهَا فَلَمَّا تَغَشّٰهَا......(۷ : ۱۸۹)

"وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اس سے تسکین حاصل کرے پھر جب وہ اس کو ڈھانک لیتا ہے..........."

۳۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ.(۲۳ : ۱)

"البتہ فلاح پائی مومنوں نے جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں۔"

۴۔ لَاتُطِعْ کُلَّ حَلَّافٍ مَّهِیْنٍ............(۶۸ : ۱۰)

"تو بہت قسمیں کھانے والے ذلیل (آدمی) کی بات نہ مان"..........."

اس صورت میں یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی شخص میں بعینہٖ وہی خصوصیات پائی جاتی ہوں۔ جیسا کہ ذیل کی آیت میں ایک بیج کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْۢبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ.(۲ : ۲۶۱)

"جیسے ایک دانے کی مثال جو سات خوشے اگائے' ہر خوشے میں سو دانے ہوں۔"

اس ارشاد سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر بیج یا دانہ اس صفت کا ہو۔ بلکہ اس سے مقصد اجر کی زیادتی کی تصویر کشی ہے۔ اگر کوئی صورت ایسی ہو جس میں بہت سی یا سبھی خصوصیات میں توافق پایا جائے' تو وہ "لزوم مالا یلزم" میں شمار ہو گی (یعنی جس کا چسپاں ہونا ضروری نہیں تھا مگر چسپاں ہو گیا۔)

بعض وقت کسی ایسے شبہ کو دور کیا جاتا ہے جو بظاہر پیدا ہو سکتا ہے یا کسی قریب الفہم سوال کا جواب کلامِ سابق کو واضح کرنے کے ارادے سے دیا جاتا ہے۔ گو اس زمانے میں نہ کسی نے شبہ ظاہر کیا ہوتا ہے' اور نہ کسی نے کوئی سوال۔ ایسے موقع پر جب صحابہؓ گفتگو کرتے تو کوئی سوال وہ بطورِ خود کرتے اور مطلب کو سوال و جواب کی صورت میں بیان کر دیتے۔ اگر ہم غور کر کے تحقیق و تلاش سے ان کی ساری گفتگو جمع کر لیں تو وہ سب باہم متصل و مربوط معلوم ہوں گی جس میں ترتیبِ نزول کے لحاظ سے مقدم یا موخر کہنے کی گنجائش نہیں رہے گی۔ یہ گویا ایسا منظم

جملہ ہو گا جس کی حد بندی کا تجزیہ کسی قاعدے سے نہیں ہو سکتا۔ بعض اوقات صحابہؓ تقدیم و تاخیر کا ذکر کرتے ہیں، تو اس سے ان کی مراد مرتبہ کے لحاظ سے تقدیم و تاخیر ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت ابن عمرؓ نے وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّةَ[1] والی آیت کے بارے میں کہا کہ:

ھٰذا قَبْلَ اَنْ تُنَزَّلَ الزَّکوٰۃ فَلَمَّا نَزَلَتْ جَعَلَھَا اللّٰہُ تَعَالٰی طُھْرًا لِلْاَمْوَالِ.

''یہ آیت زکوٰۃ نازل ہونے سے پہلے ہے۔ پھر جب زکوٰۃ نازل ہوئی تو اللہ نے اسے اموال کے لیے پاک ہونے کا ذریعہ بنا دیا۔

سب جانتے ہیں کہ آیت مذکورہ سورۂ برأت کی ہے۔ جو سب سورتوں کے بعد میں نازل ہوئی۔ اس لیے یہ آیت ان واقعات میں سے ہے جو سب سے متاخر ہیں۔ اور زکوٰۃ اس سے کئی سال پہلے فرض ہوئی۔ مگر ابن عمرؓ کی مراد یہاں یہ بات کہنے سے یہ ہے کہ اجمال کا مرتبہ تفصیل کے مرتبے سے مقدّم ہوتا ہے۔

حاصل یہ کہ مفسر کے لیے جو امور ضروری ہیں۔ وہ صرف دو ہی قسم کے ہیں۔ ایک یہ کہ غزوات وغیرہ کے واقعات کا علم ہو، جن کی خصوصیات کی طرف مختلف آیتوں میں اشارے پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ جب تک یہ علم نہ ہو تب تک متعلقہ آیات کی حقیقت تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

دوسرے یہ کہ بعض قیود کے فوائد، اور بعض مقامات پر تختی کے اسباب سے واقفیت ہو، یہ بات کیفیتِ نزول کا علم ہونے پر موقوف ہے۔ یہ مبحث درحقیقت ''فنونِ توجیہ'' میں سے ایک فن ہے۔ توجیہ کے معنی ہیں '' کلام کی صورتِ اصلی کو دکھانا۔'' اس کلمہ کا حاصل یہ ہے کہ بعض وقت

---

[1] وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ. (۹: ۳۵)

''اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انھیں دردناک عذاب کی خوش خبری دے دے۔ جس دن اس مال کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے ان کی پیشانیاں ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی۔ یہ ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔

کسی آیت میں کوئی شبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی وجہ یا تو یہ ہوتی ہے کہ اصل مطلب ذہن سے بعید ہوتا ہے' یا دو آیتوں کے درمیان تناقض دکھائی دیتا ہے یا اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ مبتدی کے ذہن میں اس آیت کی تصدیق کرنے والی آیت نہیں آتی یا کسی ''قید'' کا فائدہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ جب مفسر ایسی مشکلات کو حل کرتا ہے' تو اسی کو ''توجیہ'' کہا جاتا ہے۔ مثلاً ایک آیت میں ہے: یَـٰۤاُخْتَ هَـٰرُوْنَ ''اے ہارون کی بہن''[1] اس پر سوال کیا گیا کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے درمیان مدتِ دراز کا فاصلہ ہے۔ اس لیے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہارونؑ 'مریمؑ کے بھائی ہوں؟ گویا سائل کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اس آیت میں جو ''ہارون'' کا کلمہ آیا ہے' وہ حضرت موسیٰؑ کے بھائی ہیں۔

اس سوال کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل اپنی اولاد کے نام اسلافِ صالحین کے نام پر رکھا کرتے تھے۔

اسی طرح آپ سے پوچھا گیا کہ محشر میں آدمی منہ کے بل کس طرح چلیں گے؟ فرمایا: اِنَّ الَّذِیْٓ اَمْشَا فِی الدُّنیَا عَلٰی رِجْلَیْهِ لَقَادِرٌ عَلٰٓی اَنْ یَّمْشِیَهٗ عَلٰی وَجْهِهٖ ''یعنی جو ذاتِ پاک دنیا میں دونوں پاؤں سے چلاتی ہے وہ البتہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ منہ کے بل چلائے۔''

حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ ایک آیت میں لَا یَتَسَآءَلُوْنَ ''وہ باہم نہیں سوال کریں گے'' ہے۔ اور دوسری جگہ ہے: وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ ''اور وہ ایک دوسرے کے مقابل ہو کر باہم سوال کریں گے۔'' ان دونوں میں مطابقت کی صورت کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ پہلی صورت (عدمِ سوال کی) میدان حشر سے متعلق ہے۔ اور دوسری میں جنت میں جانے کے بعد کی کیفیت کا ذکر ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ صفا و مروہ کے درمیان اگر سعی واجب ہے' تو لَا جُنَاحَ (گناہ نہیں) کیوں فرمایا گیا؟ انہوں نے فرمایا' ایک جماعت کے لوگ ان میں سعی کو گناہ سمجھ کر اس سے اجتناب کرتے تھے۔ اس لیے ''لَا جُنَاحَ'' فرمایا گیا۔[2]

---

[1] حضرت مریمؑ کے لیے بولا گیا ہے۔

[2] پوری آیت یہ ہے: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا (بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ پس جو کعبے کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اگر وہ ان دونوں کا طواف کرے۔) (مترجم)

حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اِنْ خِفْتُمْ (اگر تم ڈرتے ہو) کی قید (یا شرط) کیوں لگائی گئی ہے؟ جواب میں فرمایا صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْكُمْ فَاقْبَلُوْا صَدَقَتَهٗ "یعنی جو صدقہ اللہ نے تم پر کیا اسے قبول کرلو۔"[۱]

اس طرح توجیہ کی مثالیں بکثرت ہیں۔ یہاں مقصد صرف آگاہ کر دینا ہے۔

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ بخاری، ترمذی اور حاکم نے جن اسبابِ نزول اور توجیہ کو اپنی اپنی تفسیروں میں صحیح اسناد کے ساتھ بیان کیا ہے، اور انھیں صحابہؓ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا ہے، چھانٹ کر اختصار کے ساتھ قلمبند کر دوں۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ اس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہر مفسر کو اتنے آثار (یا روایات) کا یاد رکھنا اسی طرح ضروری ہے، جس طرح غرائب القرآن کی شرح کا، جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ آیات کے معانی سمجھنے میں اکثر اسبابِ نزول کی ضرورت نہیں۔ البتہ ان قصوں کا کچھ دخل ہے جن کا ذکر ان تینوں تفسیروں میں ہے۔ یہ تینوں تفاسیر محدثین کے نزدیک بہت صحیح ہیں۔

---

[۱] اس سے متعلق آیت شریفہ یہ ہے: وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ إِنَّ الْكَافِرِيْنَ لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝

"اور جب تم زمین میں سفر کرو، تو تم پر کوئی گناہ نہیں اس بات میں کہ تم نماز کو تاہ کر دو اگر تم کو ڈر ہو کہ کافر تمھیں تکلیف دیں گے۔ بے شک کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔"

یہ آیت شریفہ قصر نماز کے بارے میں ہے، بعض کہتے ہیں کہ قصر صرف جنگ یا خوف کے موقع پر ہے، جیسا کہ آیت کے آخری حصے سے واضح ہے۔ مگر ابتدائی الفاظ سے حالتِ سفر میں قصر کی اجازت سمجھ میں آتی ہے۔ اور احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر قسم کے سفر کی حالت میں قصر فرماتے تھے۔

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) سے ایک صحابی نے پوچھا کہ آپ حالتِ امن میں قصر کیوں کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا، جس بات پر تمہیں تعجب ہوا ہے، اس پر مجھے بھی تعجب ہوا تھا۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ اس آیت میں اِنْ خِفْتُمْ کی قید (یا شرط) کا کیا مطلب ہے۔ فرمایا صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْكُمْ فَاقْبَلُوْا صَدَقَتَهٗ "یعنی جو صدقہ اللہ تعالیٰ نے تم پر کیا اسے تم قبول کرلو"

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اشارہ اسی واقعہ کی طرف ہے۔ (مترجم)

محمد بن اسحاق واقدی اور کلبی نے ہر آیت کے تحت جو قصہ بیان کیا ہے' افراط سے کام لیا ہے۔ محدثین کے نزدیک ان کا اکثر حصہ صحیح نہیں ہے۔ اور جو اسناد پیش کئے ہیں' وہ محل نظر ہیں۔ ان لوگوں کی اس زیادتی کو تفسیر کے لئے ضروری سمجھنا صریح غلطی ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن فہمی اس کے یاد رکھنے پر موقوف ہے' ان کو قرآن سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

مجھ میں کچھ توفیق نہیں' توفیق اللہ تعالیٰ ہی کے قبضے میں ہے' اِسی لئے میں اُسی پر بھروسہ کرتا ہوں۔ وہ عرشِ عظیم کا مالک ہے۔

فصل چہارم

بقیہ مباحث

کلام کا اصلی مطلب جن وجوہ سے مخفی رہتا ہے وہ یہ ہیں:

(۱) کلام کے بعض اجزا یا حروف محذوف ہوں۔

(۲) ایک شے کو دوسری شے سے بدلا گیا ہو۔

(۳) مؤخر کو مقدم کر دیا گیا ہو۔

(۴) مقدم کو مؤخر کر دیا گیا ہو۔

(۵) متشابہات، تعریضات اور کنایات استعمال کئے گئے ہوں۔ اور معنی مقصود کی تصویر کشی محسوسات کے ذریعے کی گئی ہو۔

(۶) استعارہ بالکنایہ اور مجازِ عقلی کا استعمال کیا گیا ہو۔

اب ہم ان سے متعلق بطور اختصار چند مثالیں پیش کرتے ہیں، تا کہ ان سے بصیرت حاصل ہو۔

حذف کی مثالیں:

حذف کی بہت سی قسمیں ہیں۔ حذفِ مضاف، حذفِ موصوف، حذفِ متعلقات وغیرہ۔

ان مثالوں پر غور کریں۔

(۱) وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ (اصل=بِرُّمَنْ اٰمَنَ)
لیکن نیکی اس شخص کی ہے جو ایمان لایا۔

(۲) وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً (۵۹:۱۷)

! اور ہم نے ثمود کو اونٹنی دی تھی، روشن۔
اَیْ اٰیَۃً مُّبْصِرَۃً لَآاَنَّھَا مُبْصِرَۃٌ غَیْرَ عُمْیَاءَ
یعنی روشن معجزے (یا نشانی) کے طور پر۔ یہ نہیں کہ وہ بینا تھی اور اندھی نہیں تھی (آیت محذوف ہے)

۳۔ وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْعِجْلَ (۲:۹۳)
ان کے دلوں میں بچھڑا بس گیا تھا۔
(اَیْ حُبَّ الْعِجلِ) "(یعنی بچھڑے کی محبت بس گئی تھی" (حُبَّ محذوف ہے۔)

۴۔ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَکِیَّۃً بِغَیْرِ نَفْسٍ (۱۸:۷۴)
کیا تو نے ایک پاک جان کو قتل کر دیا بغیر کسی جان کے؟
(اَی بِغَیْرِ قَتْلِ نَفْسٍ) او فَسَادٍ (اَی: اَوْ بِغَیْرِ فَسَادٍ)
(یعنی بغیر کسی جان کے قتل کے یا فساد کے)۔ (یعنی یا بغیر کسی فساد کے)

۵۔ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ.
جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔
(اَیْ: مَنْ فِی السَّمٰوات وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ)
(یعنی جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے)
لِاَنَّ شَیْئًا وَّاحِدًا ھُوَ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ.
کیونکہ ایک ہی چیز آسمانوں اور زمین میں ہے۔

(۶) ضِعْفَ الْحَیَاۃِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ (۱۷:۷۵)
زندگی میں دوگنا اور موت پر دوگنا۔
(اَیْ: ضِعْفَ عَذَابِ الْحَیَاۃِ وَضِعْفَ عَذَابِ الْمَمَاتِ)
(یعنی زندگی میں دوگنا عذاب اور مرنے پر دوگنا عذاب)

(۷) وَاسْئَلِ الْقَرْیَۃَ (۱۲:۸۲)
اور پوچھ لے بستی سے
(اَیْ: اَھْلَ الْقَرْیَۃِ)

(یعنی بستی والوں سے)

(۸) بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا (۱۴ : ۲۸)

بدل دیا اللہ کی نعمت کو کفر سے

(اَیْ: فَعَلُوْا مَكَانَ شُكْرِ نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا)

یعنی: اللہ کی نعمت کا شکر کرنے کے بجائے انہوں نے کفر کیا (یا کفرانِ نعمت کیا)

(۹) يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (۱۷ : ۹)

رہنمائی کرتا ہے، اس کی طرف جو بہت سیدھا ہے

(اَیْ: لِلْخَصْلَةِ الَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ)

(یعنی اس خصلت کی طرف جو بہت سیدھی ہے)

(۱۰) بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (۱۶ : ۱۲۵)

اس سے جو بہت عمدہ ہو۔

(اَیْ: بِالْخَصْلَةِ الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ)

(یعنی ایسی خصلت سے جو بہت عمدہ ہو)

(۱۱) سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنٰى (۲۱ : ۱۰۱)

پہلے آ چکی ہے جن کے لئے ہماری طرف سے بھلائی۔

(اَیْ كَلِمَةُ الْحُسْنٰى وَالْعِدَةُ الْحُسْنٰى)

(یعنی بھلائی کی بات یا بھلائی کا وعدہ)

(۱۲) عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمَانَ (۲ : ۱۰۲)

سلیمان کی بادشاہی پر

(اَیْ عَلٰى عَهْدِ مُلْكِ سليمان)

(یعنی سلیمان کی بادشاہی کے عہد میں)

(۱۳) وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ (۳ : ۱۹۴)

تو نے وعدہ کیا ہم سے اپنے رسولوں پر

(اَیْ عَلٰى اَلْسِنَةِ رُسُلِكَ)

(یعنی اپنے رسولوں کی زبان پر)

(۱۴) اِنَّآ اَنزَلْنَاهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ.

بے شک ہم نے اتارا، اسے شب قدر میں

(اَیْ اَنزَلْنَا الْقُرْاٰنَ وَاِنْ لَّمْ یَسْبِقْ لَهٗ ذِکْرٌ.)

(یعنی قرآن کو اُتارا۔ قرآن کی جگہ ضمیر لائی گئی ہے، حالانکہ اس سے پہلے قرآن مذکور نہیں ہے)

(۱۵) حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ (اَیْ تَوَارَتِ الشَّمْسُ)

یہاں تک کہ چھپ گیا پردے میں۔

(یعنی آفتاب چھپ گیا)

(۱۶) عَبَدَالطَّاغُوْت (۵: ۶۰)

بندگی کی طاغوت کی

(اَیْ جَعَلَ مِنْهُمْ مَنْ عَبَدَالطَّاغُوْتَ)

(یعنی بنا دیا ان میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے طاغوت کی بندگی کی)

(۱۷) فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا

پھر بنا دیا اس کے لیے نسب اور سسرالی رشتہ

(اَیْ جَعَلَ لَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا)

(یعنی جَعَلَ لَهٗ کی بجائے جَعَلَهٗ ہے)

(۱۸) وَاخْتَارَ مُوْسٰی قَوْمَهٗ (۷: ۱۵۵)

اور چن لیا موسیٰ نے اپنی قوم کو

(اَیْ مِنْ قَوْمِهٖ)

(یعنی اپنی قوم میں سے)

(۱۹) اَلَآ اِنَّ عَادًا کَفَرُوْا رَبَّهُمْ (۱۱: ۶۰)

یاد رکھو! عاد نے انکار کیا، تھا اپنے رب کا

(اَیْ کَفَرُوْا نِعْمَةَ رَبِّهِمْ اَوْ کَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ)

(یعنی اپنے رب کی نعمت کا انکار کیا تھا یا اپنے رب کا انکار کیا تھا)

اس آیت میں یا تو مضاف محذوف ہے جو نعمت ہے یا حرف جر (بِ) محذوف ہے جو رَبِّهِمْ کے ساتھ ہے۔

(۲۰) تَفْتَؤُا (۱۲:۸۵)

تو ہمیشہ رہے۔

(اَیْ لا تَفْتَؤُا وَمَعْنَاہُ لا تَزَالُ)

لا تَفْتَؤُا کی جگہ ہے جس کے معنی لَا تَزَالُ کے ہوتے ہیں، یہاں لا محذوف ہے۔

(۲۱) مَانَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی (۳۹:۳)

ہم نہیں عبادت کرتے ہیں ان کی مگر اس لئے کہ وہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔

(اَیْ یَقُوْلُوْنَ مَا نَعْبُدُھُمْ) یہاں یَقُوْلُوْنَ محذوف ہے۔

(یعنی وہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں عبادت کرتے ہیں ان کی)

(۲۲) اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا لْعِجلَ (۷:۱۵۲)

بے شک جن لوگوں نے بنالیا بچھڑے کو

(اَیْ اَلَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجلَ اِلٰھًا) یہاں ایک مفعول محذوف ہے۔

(یعنی جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا)

(۲۳) کُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْیَمِیْنِ. (۳۷:۲۹)

تم آتے تھے ہمارے پاس دائیں طرف سے۔

(اَیْ وِعَنِ الشِّمَالِ)

(یعنی تم ہمارے پاس دائیں بائیں سے آتے تھے) اس میں معطوف کو حذف کر دیا ہے۔

(۲۴) لَوْنَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْکُمْ مَلآئِکَۃً (۴۳:۶۰)

اگر ہم چاہیں تو بنادیں تمہارے بدلے فرشتے کو

(اَیْ: بَدَلًا مِنْکُمْ)

(یہاں مِنْکُمْ سے پہلے بَدَلًا محذوف ہے اور وہ مفعول ہے)

(۲۵) فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ (۵۶: ۶۵)

تو تم تعجب کرنے لگو کہ ہم پر جرمانہ لگ گیا۔

(اَیْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ)

(یعنی تم کہو گے کہ ہم پر جرمانہ لگ گیا)

(۲۶) كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ (۸: ۵)

جیسا نکالا تجھے تیرے رب نے

(اَیْ اَمْضِ) (یعنی چلا جا)

جاننا چاہیئے کہ قران مجید میں اِنَّ کی خبر اکثر محذوف ہوتی ہے۔ اسی طرح شرط کی جزا مفعول، مبتدا وغیرہ بھی عام طور پر محذوف ہوتے ہیں' مگر ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب کہ بعد میں آنے والا لفظ حذف پر دلالت کرتا ہو۔

(۲۷) فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۶: ۱۴۹)

(۲۷) پس اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت کرتا۔

(اَیْ لَوْ شَاءَ هِدَايَتَكُمْ لَهَدٰىكُمْ)

(یعنی اگر وہ تمہاری ہدایت چاہتا تو ہدایت کر دیتا) اس مثال میں مفعول محذوف ہے۔

(۲۸) اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (۲: ۱۴۷)

حقیقت تیرے رب کی طرف سے ہے

(اَیْ هٰذَا الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ)

(یعنی یہ حقیقت تیرے رب کی طرف سے ہے) یہاں اسم اشارہ محذوف ہے۔

(۲۹) لَا يَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا (۵۷: ۱۰)

برابر نہیں ہے تم میں سے وہ جس نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور جنگ کی ایسے لوگ درجہ میں بڑے ہیں ان سے جنہوں نے فتح کے بعد خرچ کیا اور جنگ کی۔

(اَیْ لَا يَسْتَوِیْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَمَنْ اَنْفَقَ مِنْۢ بَعْدَ الْفَتْحِ)

برابر نہیں ہے وہ شخص جس نے فتح سے قبل خرچ کیا اور جس نے فتح کے بعد خرچ کیا

اس میں ''مَنْ اَنْفق من قَبلِ الْفتحِ '' کے بعد ''مَنْ اَنْفَقَ مِنْ بَعْدِ الْفَتحِ ''محذوف ہے۔اوراس حذف پر ''اُولٰئک اَعظمُ درجةً دلالت کررہا ہے۔

(۳۰) وَاِذا قِیلَ لَهُمُ اتَّقُوْا ما بَیْنَ اَیْدِیکُمْ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ٥ ماتَاْتِیهِمْ مِنْ اٰیةٍ مِنْ اٰیَات رَبِّهِمْ اِلَّا کَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ٥(۳۶:۴۵)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بچو اس سے جو تمہارے آگے ہے اور تمہارے پیچھے ہے تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ اور ان کے پاس ان کے رب کی آیتوں میں سے جو بھی آیت آتی ہے، اس سے وہ منہ پھیرتے ہیں۔

(ایْ اِذَا قِیلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَابَیْنَ اَیْدِیکُمْ وَمَا خَلْفَکُمْ اَعْرَضُوْا)

(یعنی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بچو اس سے جو تمہارے آگے ہے اور تمہارے پیچھے ہے تو وہ اس سے منہ پھیرتے ہیں)

(درمیان میں ''اعْرَضُوْا '' محذوف ہے' اور اس کے حذف ہونے پر آخری الفاظ دلالت کررہے ہیں۔)

یہ بھی جاننا چاہئے کہ اذ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ (جب کہا تیرے رب نے فرشتوں سے) اور اذْ قَالَ مُوْسٰی (جب کہا موسیٰ نے) جیسے مقامات میں ''اِذْ'' اصل میں ''ظرفِ فعلی'' ہوتا ہے۔ مگر یہاں ہول پیدا کرنے اور ڈرانے کے معنی میں نقل کیا جاتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص کسی ہولناک موقع یا ہولناک واقعہ کا ذکر کرتا ہے تو وہ کئی باتوں کا بیان اس طرح کرتا ہے کہ اس میں جملے کی ترکیب تسلسل اور اعراب کو مدنظر نہیں رکھتا' بلکہ اس واقعہ کا نقشہ مخاطب کے ذہن میں جمانا مقصود ہوتا ہے تاکہ اس سے اس کے دل پر خوف طاری ہو جائے۔ واللہ اعلم

وہ ''اَنْ'' جس سے مصدری معنی پیدا ہوتے ہیں[1] اس کے شروع میں حرفِ جر کو حذف کرنا عربی زبان میں عام ہے۔ اس کے معنی کبھی لانْ اور کبھی بانْ اور کبھی اِنَّ کے ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی جاننا چاہئے کہ جن آیتوں میں ''وَلَوْ'' آتا ہے۔ وہاں شرط کے بعد جوابِ شرط ہوتا ہے' اور نہیں بھی ہوتا۔ جیسے

---

[1] مثلاً اَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ ''تمہارا روزہ رکھنا بہتر ہے تمہارے لیے'' مترجم

(۱) وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ

''اگر تو دیکھ لیتا وہ حالت جبکہ ظالم موت کی سختیوں میں ہوتے ہیں۔''

(۲) وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ

''اگر دیکھ لیں وہ لوگ جو ظالم ہیں اس وقت کو جبکہ وہ عذاب کو دیکھیں گے۔

ایسی آیتوں میں لَوْ (حرف شرط) آتا ہے تو جواب شرط محذوف ہوتا ہے۔

اہلِ عرب اس طرح کی ترکیب مخاطب میں تعجب پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے محذوف کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔

اِبدال:

کلام میں تصرّف کو اِبدال کہتے ہیں۔ یہ کئی طرح پر ہوتا ہے کبھی ایک فعل کو دوسرے فعل کی جگہ مختلف اغراض کے لیے رکھتے ہیں۔ ان اغراض کا ذکر تفصیل سے کرنا اس کتاب کا مقصد نہیں ہے۔ (مگر چند مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں):

(۱) اَهٰذَا الَّذِىْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ (۲۱:۳۶)

''کیا یہ وہ شخص ہے جو ذکر کرتا ہے تمہارے معبودوں کا؟''

(اَىْ يَسُبُّ اٰلِهَتَكُمْ)

(یعنی گالی دیتا ہے تمہارے معبودوں کو)

چونکہ گالی کا لفظ مکروہ تھا۔ اس لیے اس کے بدلے ذکر کا استعمال کیا۔ اس قسم کے محاورات عام طور پر مستعمل ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں ''فلاں کے دشمن بیمار ہو گئے۔'' اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ''فلاں صاحب بیمار ہو گئے۔'' اسی طرح کہتے ہیں ''بندگانِ جناب تشریف لائے'' یا ''جنابِ عالی کے بندے اس امر سے واقف ہیں۔'' تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ ''آپ تشریف لائے'' یا ''آپ اس امر سے واقف ہیں۔''

(۲) مِنَّا لَا يُصْحَبُوْنَ (۲۱:۳۶)[۱]

---

۱ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ

''وہ آپ اپنی مدد کی طاقت نہیں رکھتے ہیں۔ اور نہ وہ ہماری طرف سے ساتھ دیے جائیں گے (یعنی مدد کیے جائیں گے)

''ہماری طرف سے ساتھ نہیں دیے جائیں گے''

(اَیْ مِنَّا لَایُنْصَرُوْنَ)

(یعنی ہماری طرف سے مدد نہیں کیے جائیں گے)

چونکہ نصرت بلا ملاقات وصحبت نہیں ہوسکتی اس لیے یُنْصَرُوْنَ کے بدلے یُصْحَبُوْنَ آیا ہے۔

(۳) ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۷: ۱۸۷)

''بھاری ہوئی آسمانوں اور زمین میں۔''

(اَیْ خُفِیَتْ) (یعنی پوشیدہ ہوئی)

اس لیے کہ جب کوئی چیز پوشیدہ ہوتی ہے تو آسمان اور زمین والوں پر اس کا علم دشوار ہوتا ہے۔

(۴) فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا (۴: ۴)

''پھر اگر وہ عورتیں خوشی سے چھوڑ دیں اس میں سے کچھ خود ہی''

(اَی عَفَوْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ عَنْ طِیْبَةٍ مِنْ نَفُوْسِهِنَّ)

(یعنی معاف کر دیں تمہارے لئے وہ عورتیں بطیب خاطر)

یہاں عَفَوْنَ کے بدلے طِبْنَ کا استعمال ہوا ہے کیونکہ اس میں خوش دلی کا مفہوم شامل ہے۔

(۵) فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِیْنَ (۲۶: ۴) (اَیْ خَاضِعَةً)

''پس ہو جائیں ان کی گردنیں اس کے سامنے جھکنے والی''

(۶) فَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِیْنَ (۶۶: ۱۲)

''پس وہ تھی فرماں برداروں میں سے''

(اَیْ مِنَ الْقَانِتَاتِ)[1]

(یعنی قانتات میں سے یا فرماں بردار عورتوں میں سے)

''قَانِتِیْنَ'' کا استعمال ''قَانِتَاتٌ'' کے بدلے استعمال ہوا ہے

---

[1] یہ آیت حضرت مریمؑ کے بیان کے سلسلے میں ہے۔ (مترجم)

(۷) وَمَالَهُمْ مِّنْ نَّاصِرِيْنَ

''اور نہیں ان کے لیے مددگاروں میں سے''

(اَیْ مِنْ نَاصِرٍ) (یعنی کوئی مددگار)

(۸) فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ (۶۹: ۴۷)

''پھر تم میں نہ ہوتا کوئی اس سے روکنے والے''

(اَیْ عَنْهُ حَاجِزٍ) (یعنی ان سے روکنے والے)

(۹) وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ.

''زمانہ گواہ ہے کہ انسان خسارے میں ہے''۔

(اَیْ اَفْرَادُ بَنِیْٓ اٰدَمَ) (یعنی سب بنی آدم)

انسان کو مفرد یا واحد اس لیے فرمایا کہ وہ اسم جنس ہے۔

(۱۰) يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا (۸۴: ۶)

''اے انسان! بے شک تو سخت محنت سے اپنے رب کی طرف پہنچنے والا ہے''

(اَلْمَعْنٰی یَا بَنِیْٓ اٰدَمُ اِنَّكُمْ......) (یعنی اے بنی آدم تم......)

یہاں لفظ انسان مفرد لانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسمِ جنس ہے۔ ''سب آدمیوں'' کا مفہوم اس میں ہے۔

(۱۱) وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ.

''اور اُٹھالیا اُسے انسان نے'' (یعنی افرادِ انسان نے)

(۱۲) كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ۣالْمُرْسَلِيْنَ.

''جھٹلایا نوح کی قوم نے رسولوں کو''

(اَیْ نُوْحًا وَحْدَهٗ) (یعنی اکیلے نوح کو)

(چونکہ تمام رسول ایک ہی تعلیم (توحید) لے کر آئے تھے، اس لیے ایک نبی کو جھٹلانا سب کو جھٹلانا ہے)

(۱۳) اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ.

''ہم نے فتح دی تجھ''

(اِنِّیْ فَتَحْتُ لَکَ (یعنی میں نے فتح دی تجھے)

(۱۴) اِنَّا لَقَادِرُوْنَ.

"ہم البتہ قادر ہیں"

(اَیْ اِنِّیْ لَقَادِرٌ (یعنی میں قادر ہوں)

(۱۵) وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یُسَلِّطُ رُسُلَہٗ.

"لیکن اللہ مسلط کرتا ہے اپنے رسولوں کو"

(اَیْ یُسَلِّطُ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمُ)

(یعنی مسلط کرتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) یہاں "رُسُلَہٗ" محمد کی جگہ آیا ہے۔

(۱۶) اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ (۳:۱۷۳)

"وہ جن سے کہا لوگوں نے"

(اَیْ عُرْوَۃُ الثَّقَفِیْ (یعنی عروہ ثقفی نے)

یہاں اسم جنس "النَّاسُ" سے خاص (عروہ) مراد ہے۔

(۱۷) فَاَذَاقَھَا اللّٰہُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (۱۶:۱۱۲)

"پھر چکھایا اللہ نے اسے بھوک اور خوف کا لباس"

(یہاں بھوک اور خوف کے مزے کو "لباس" سے بدلا گیا ہے اس لیے کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ لاغری اور پژمردگی بھوک کے سبب سے ہوتی ہے۔ جو تمام بدن کو لباس کی طرح ڈھانک لیتی ہے)

(۱۸) صِبْغَۃَ اللّٰہِ (۲:۱۳۸)

"اللہ کا رنگ"

(اَیْ دِیْنَ اللّٰہِ) (یعنی اللہ کا دین)

یہاں "دیـنُ" کے بدلے "صِبْـغَۃَ" اس لیے ہے کہ اس سے یہ ظاہر ہو جائے کہ دین سے نفوسِ انسانی ایسے رنگے جاتے ہیں جیسے کپڑا۔ یا قولِ نصاریٰ کی مشاکلت کہ وہ بچے کی پیدائش کے وقت رنگ میں غوطہ دیتے ہیں۔

(۱۹) وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ

''اور طورِ سینا کی قسم''

(۲۰) سَلَامٌ عَلٰی اِلْیَاسِیْنَ.

''سلام ہے الیاسین پر''

(اَیْ عَلٰی اِلْیَاسَ) (یعنی الیاس پر)

قافیے کی رعایت سے الیاس کے بدلے اِلیاسین ہے۔

بعض اوقات کسی حرف کو دوسرے حرف سے بدل دیتے ہیں۔ (اس کی مثالیں درج ذیل ہیں)۔

(۱) فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ (۷:۱۴۳)

''پھر جب اس کے رب نے تجلّی کی پہاڑ کے لئے''

(اَیْ عَلَی الْجَبَلِ) (یعنی پہاڑ پر)

کوہِ طور پر اللہ کی تجلّی ویسی ہی تھی جیسی درخت پر اس سے پہلے ہو چکی تھی۔

(۲) هُمْ لَهَا سَابِقُوْنَ (۲۳:۶۱)

''وہ اس کے لیے سبقت کرنے والے ہیں''

(اَیْ اِلَیْهَا سَابِقُوْنَ)

(یعنی وہ اس کی طرف سبقت کرنے والے ہیں) (''اِلٰی'' کی جگہ ''ل'' آیا ہے)

(۳) لَایَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ.

''نہیں ڈرتے میرے حضور مگر وہ جس نے ظلم کیا''

(اَیْ لٰکِنْ مَنْ ظَلَمَ)

(یعنی لیکن وہ شخص ڈرتا ہے جس نے ظلم کیا) دوسرا حصہ ایک علیحدہ جملہ ہے۔

(۴) لَاُصَلِّبَنَّکُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ. (۲۰:۷۱)

''میں ضرور تم کو سولی دوں گا کھجور کے تنوں میں''

(اَیْ عَلٰی جُذُوْعِ النَّخْلِ) (یعنی کھجور کے تنوں پر)

(۵) اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ یَّسْتَمِعُوْنَ فِیْهِ. (۵۲:۳۸)

''یا اُن کے لیے سیڑھی ہے جس میں وہ سن لیتے ہیں؟''

(اَیْ یَسْتَمِعُوْنَ عَلَیْهِ) ۱

(یعنی اس پر چڑھ کر وہ سنتے ہیں)

یہاں عَلٰی کے بدلے فِیْ کا استعمال ہوا ہے۔

(۶) اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِہٖ.

''آسمان پھٹنے والا ہے اس سے''

(اَیْ مُنْفَطِرٌ فِیْهِ) (یعنی آسمان اس میں پھٹنے والا ہے)

حرفِ جر فی کی جگہ ''ب'' کا استعمال ہے۔

(۷) مُسْتَکْبِرِیْنَ بِہٖ (۲۳:۶۷)

''تکبر کرتے ہوئے اس سے''

(اَیْ عَنْهُ) (یعنی اُس سے متعلق)

یہاں عَنْ کو ب سے بدلا گیا ہے۔

(۸) اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ.

پکڑ لیا اسے عزت نے گناہ کے لیے۔

(اَی حَمَلَتْهُ الْعِزَّةُ عَلَی الْاِثْمِ) ۲

یعنی اسے عزت نے گناہ پر ابھار دیا۔

(۹) فَاسْئَلْ بِہٖ خَبِیْرًا (۲۵:۵۹)

''پس پوچھ لے اس سے خبر دینے والے کو''

(اَیْ فَاسْئَلْ عَنْهُ) (پس پوچھ لے اس سے متعلق خبر رکھنے والے سے)

(۱۰) لَا تَاْکُلُوْا اَمْوَالَهُمْ اِلٰی اَمْوَالِکُمْ ''نہ کھاؤ ان کے مال اپنے اموال کے ساتھ''

(اَیْ مَعَ اَمْوَالِکُمْ) (یعنی اپنے مال کے ساتھ)

(۱۱) اِلَی الْمَرَافِقِ

---

۱ اس آیت شریفہ میں ''سُلَّمٌ'' بطور مجاز ذریعہ یا سبب کے معنی کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا ان کے پاس کوئی ذریعہ ہے جس سے وہ آسمانی باتیں معلوم کر لیتے ہیں؟ (مترجم)

۲ یعنی عزت و وقار کا خیال اسے گناہ پر آمادہ کرتا ہے۔

''کہنیوں تک''

(اَیْ مَعَ الْمَرَافِقِ) (یعنی کہنیوں کے ساتھ)

(۱۲) یَشْرَبُ بِهَا(۶:۷۶)

''پئیں گے جس کو'' (یا جس سے)

(یَشْرَبُ مِنْهَا) (یعنی پئیں گے جس سے)

(۱۳) مَا قَدَرُوْ اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ اِذْ قَالُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ (۶:۹۱)

''انہوں نے نہیں اندازہ لگایا اللہ کا' اس کا سچا اندازہ جب کہا کہ نہیں اتارا اللہ نے کچھ بھی''۔

(اَیْ اَنْ قَالُوْا) (یہاں ''اِذْ'' 'اَنْ' کی جگہ آیا ہے)

کبھی ایک جملے کو دوسرے جملے کی جگہ لے آتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک جملہ دوسرے جملے کے حاصلِ مضمون پر دلالت کرتا ہے' اور اس کی موجودگی کا سبب ہوتا ہے تو پہلے جملے کو دوسرے جملے سے بدل دیا جاتا ہے۔ جیسے:

(۱) وَاِنْ تُخَالِطُوْ هُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (۲:۲۲)

''اور اگر تم ان کو مِلا جُلا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں''۔

(اَیْ اِنْ تُخَالِطُو هُمْ لَا بَأْسَ بِذَالِكَ لِاَنَّهُمْ اِخْوَانُكُمْ وَ شَانُ الْاَخِ اَنْ يُّخَالِطَ اَخَاهُ)

(یعنی اگر تم اپنا اور ان کا خرچ مشترک رکھو تو کوئی مضائقہ نہیں، اس لیے کہ وہ تمہارے بھائی ہیں اور بھائی کی شان یہ ہے کہ اپنے بھائی سے مل جل کر رہے)

اس مثال میں ''فَاِخْوَانُكُمْ'' دلالت کرتا ہے ''لَا بَأْسَ'' کے مفہوم پر۔ لہذا ''لَا بَأْسَ بِذَالِكَ'' کہنے کے بدلے ''فَاِخْوَانُكُمْ'' فرما دیا۔

(۲) لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ (۲:۱۰۳)

''البتہ اللہ کے ہاں سے بدلہ اچھا ہے''۔

(لَوْ جَدُوْا ثَوَابًا وَّ مَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ)

(یعنی وہ اللہ کی جانب سے ضرور اچھا بدلہ پاتے)

اس آیت میں بھی لَمَثُوبَۃٌ' لَوجَدُوا کے حاصلِ معنی پر دلالت کرتا ہے اس لیے اس کا بیان کیا گیا اور دوسرے کو (یعنی لَوجَدُوا کو) چھوڑ دیا گیا۔ کیونکہ اس کا مفہوم بغیر اس کے ہی ذہن میں آجاتا ہے۔

(۳) اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّہٗ مِنْ قَبْلُ (۱۲: ۷۷)

''اگر اس نے چوری کی ہے تو چوری کی تھی اس کے بھائی نے بھی اس سے پہلے''۔

(اَیْ اِنْ سَرَقَ فَلَا عَجَبَ لِاَنَّہٗ سَرَقَ اَخٌ لَّہٗ مِنْ قَبْلُ)

(یعنی اگر اس نے چوری کی تو تعجب نہیں اس سے پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی)۔

(۴) مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّہٗ نَزَّلَہٗ قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰہِ (۲: ۹۷)

''جو دشمن ہے جبریل کا (وہ یہ جان لے) کہ جبریل نے اللہ ہی کے حکم سے تیرے قلب پر قرآن اتارا ہے''۔

(اَیْ مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِیْلَ فَاِنَّ اللّٰہَ عَدُوٌّ لَّہٗ)

(یعنی جو جبریل کا دشمن ہے تو بے شک اللہ اس کا دشمن ہے)۔

(آیت شریفہ میں فَاِنَّ اللّٰہَ عَدُوٌّ لَّہٗ محذوف ہے۔ اس کا پتا فَاِنَّہٗ نَزَّلَہٗ عَلٰی قَلْبِکَ کے جملے سے چلتا ہے۔ کیونکہ جبریل اللہ کے حکم کی تعمیل کرتا ہے اس طرح کہ وہ تیرے قلب پر کلامِ الٰہی اتارتا ہے۔ تو جو شخص اس سے دشمنی کرے وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ اس سے دشمنی کرے۔)

بعض اوقات اصل جملہ کسی لفظ کو نکرہ کی صورت میں استعمال کرنے کا مقتضی ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ لام تعریف یا اضافت داخل کر کے تصرف کر دیتے ہیں۔ اس صورت میں مفہوم نکرہ ہی کا رہتا ہے۔ مثلاً: وَقِیْلِہٖ یَا رَبِّ[۱] اور اس کی پکار ''یارَبِّ'' (اے میرے رب)

پوری آیت شریفہ یہ ہے۔

[۱] وَقِیْلِہٖ یَا رَبِّ اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا یُؤْمِنُوْنَ۔ اور اس کی پکار کہ ''اے میرے رب یہ سب وہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے ہیں''۔

وَقِیْلِہٖ میں ضمیر آنحضرت ﷺ کی طرف ہے اور قیل یہاں اسم مصدر یا اسم مفعول ہے۔ (کہنا یا قول یا پکار کے معنی ہیں) اور واو قسمیہ ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ رسول کے اس پکار کی قسم۔ پکار کا جملہ بعد میں ہے لہٰذا وَقِیْلِہٖ یَا رَبِّ والے پورے جملے کا مفہوم ہے۔ (مترجم)

(اىْ رَبٌّ قِيلَ لَهُ يَا رَبِّ)

(یعنی وہ رب جسے پکارا گیا ''یَا رَبِّ'')

(یہ مفہوم ''قِيلِهِ يَا رَبِّ'' میں آ گیا۔ اور مختصر ہو گیا۔)

(۲) حَقُّ الْيَقِيْنِ۔ ''یقین کا حق''

(اى حَقُّ يَقِيْنٍ) (یقین کا حق)

''ال'' کی اضافت اس لیے ہے کہ اس سے تلفظ میں سہولت ہے۔

کبھی کلام کو طبعی قاعدے سے ہٹا کر مذکر کے بدلے مؤنث اور مؤنث کے بجائے مذکر واحد کی جگہ جمع اور جمع کی جگہ واحد لاتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر صرف معنی مطلب کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ مثلاً:

(۱) فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّىْ هٰذَآ اَكْبَرُ

''پھر جب اس نے آفتاب کو روشن دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے' یہ بہت بڑا ہے''۔

اس میں شمس کو ''بَازِغَةً'' کہہ کر مؤنث کہا۔ مگر بعد میں اسمِ اشارہ (هٰذَا) اُسی کے لیے مؤنث کے بجائے مذکر استعمال کیا (مؤنث هٰذهِ ہے) پس ظاہر ہے کہ صرف معنی مطلب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

(۲) مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَنَارًا فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَاحَوْلَهُ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ (۲:۱۷)

''ان کی مثال ایسی ہے جیسے اس کی جس نے آگ روشن کی تو جب اس نے روشن کر دیا اپنے ماحول کو تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی چھین لی''۔

اس آیت میں ضمیر واحد کے بدلے ضمیر جمع مستعمل ہے۔[۱]

کبھی تثنیہ کے بجائے واحد مذکور ہوتا ہے۔ جیسے اس آیت میں:

(۱) اِلَّآ اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ (۹:۷۴)

---

[۱] بِنُوْرِهِمْ کی ضمیر کا مرجع ''نَار'' کے بجائے ان لوگوں کی طرف بھی ہو سکتا ہے، جن کے بارے میں بیان چلا آ رہا ہے۔ اس صورت میں نور سے مراد ''نورِ بصارت'' ہوگی۔ (مترجم)

''لیکن یہ کہ غنی کر دیا ان کو اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے''۔

فَضْلِهٖ میں ضمیر واحد ہے بجائے ''فَضْلِهِمَا'' کے۔ کیونکہ اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول دو کا ذکر ہے۔

(۲) اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَ اٰتٰنِىْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ط

''اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی جناب سے رحمت عطا کی ہے اور وہ تم کو دکھائی نہیں دیتی''۔

اس میں دو چیزوں کا ذکر ہے: (۱) بَيِّنَةٌ اور (۲) رَحْمَةٌ۔ اس لیے بظاہر فَعُمِّيَتَا (تثنیہ کا صیغہ) ہونا چاہیے تھا۔ مگر واحد لایا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دونوں چیزیں ایک ''شے واحد'' کی مثل ہیں۔

(۴) اسی طرح ''اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ'' کو سمجھنا چاہیے۔

عام طور پر جملہ کی طبعی ساخت کا اقتضا یہ ہوتا ہے کہ جزا کو صورتِ جزا میں اور شرط کو صورت شرطیہ اور جوابِ قسم کی صورت میں رکھا جائے۔ تاہم اس میں بھی بعض اوقات تصرف کرتے ہیں اور جزا کو ایک مستقل جملہ بنا دیتے ہیں، ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کسی خاص معنی کی طرف میلان ہو، مگر اس کے ساتھ کوئی ایسی بات قائم رکھتے ہیں جو کسی نہ کسی لحاظ سے اصل بات کی طرف دلالت کرے۔ (جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے واضح ہوگا):

(۱) وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ○ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ○ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ○ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ○ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ○ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ[1] (۷۹: ۱-۶)

---

[1] ان آیات کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں۔ بعضوں نے ان سے مختلف کاموں پر مامور فرشتے مراد لیے ہیں۔ اور بعضوں نے ان سے مراد نفوسِ انسانی لی ہے۔ نازعات سے مراد موت کے وقت نکلنے والی روحیں ہیں۔ ناشطات، مومنوں کی روحیں ہیں جو موت کے وقت مسرت و شادمانی سے نکلتی ہیں، اور سابقات، وہ روحیں جو قبض کے وقت خود سبقت کرتی ہیں۔ انہی کو سابحات (یعنی تیرنے والیاں) اس لیے کہا کہ یہ بسہولت ترقی کر کے مدارج کمال کو پہنچتی ہیں۔
بعض نے یہ تفسیر کی ہے کہ نازعات سے مراد مجاہد ہیں جو پوری قوت سے کمان کھینچ کر تیر چلاتے ہیں۔ ناشطات سے مراد وہ ہیں جو خوشی خوشی دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ''سابحات'' تیزی سے کام کرنے والے سابقات، دشمن کی طرف بڑھنے والے، اور مدبرات امور ملکی کی تنظیم کرنے والے ہیں۔ (مترجم)

گواہ ہیں اپنے کام میں غرق ہونے والیاں، مسرور ہونے والیاں اور تیرنے والیاں اور سبقت کرنے والیاں، اور امر کی تدبیر کرنے والیاں، کہ جس دن کانپنے والی کانپے گی۔

ان چھ آیتوں میں پہلی پانچ آیتیں قسم کی ہیں، ان سب کا جواب قسم چھٹی آیت ہے (یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَۃُ)۔ اور یہی آیت دلالت کرتی ہے حق کی طرف۔

معنی یہ ہیں کہ جس طرح یہ سب باتیں حق ہیں، اسی طرح وہ دن بھی حق ہے جس میں حشر ونشر ہوگا۔

(۲) وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝ وَالْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝ وَ شَاھِدٍ وَّ مَشْھُوْدٍ ۝ قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ ۝ (۸۵:۱/۴)

''گواہ ہے برجوں والا آسمان، اور وعدہ کیا ہوا دن اور شاہد اور جس کی گواہی دی گئی (کہ) خندق والے ہلاک ہوگئے''۔

پہلے تین قسمیں کھائیں (یعنی تین چیزوں کی شہادت پیش کی) ان تینوں قسموں کا جواب قسم آخری آیت ہے (قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ)۔

(مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ تینوں باتیں حق ہیں، اسی طرح اعمال کی پاداش بھی یقینی ہے)

(۳) اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ وَاَذِنَتْ لِرَبِّھَا وَحُقَّتْ ۝ وَاِذَاالْاَرْضُ مُدَّتْ ۝ اَلْقَتْ مَافِیْھَا وَتَخَلَّتْ ۝ وَاَذِنَتْ لِرَبِّھَا وَحُقَّتْ ۝ یٰۤاَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ (۸۴:۱/۶)

''جب آسمان پھٹ جائے گا۔ اور اپنے رب کا حکم مانے گا اور وہ اسی لائق ہے۔ اور جب زمین پھیل جائے گی۔ اور جو کچھ اس میں ہے نکال دے گی۔ اور خالی ہو جائے گی اور اپنے رب کا حکم مانے گی کیونکہ وہ اسی لائق ہے، اے انسان تو مشقت کر کے جانے والا ہے اپنے رب کی طرف۔''

(آسمان اور زمین کی کیفیت بیان کر کے انسان کو خطاب فرمایا، اور حساب و جزا کو یاد دلایا۔)

کبھی کلام کے اسلوب کو پلٹ دیا جاتا ہے۔ مثلاً جہاں خطاب ہوسکتا ہے، وہاں غائب

لے آتے ہیں جیسے:

حَتّٰیٓ اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْکِ وَجَرَیْنَ بِھِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَۃٍ(۱۰ : ۲۲)

"حتیٰ کہ تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ انھیں لے کر اچھی ہوا سے چلتی ہیں"۔

(بِھِمْ' بِکُمْ کی جگہ لایا گیا ہے۔

کبھی خبر کی جگہ انشاء اور انشاء کی جگہ خبر لے آتے ہیں۔ جیسے:

(۱) فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِھَا (۶۷ : ۱۵)

پس تم چلو اس کے اطراف میں۔

یہاں اِمْشُوْا' تَمْشُوْنَ (تم چلتے ہو) کی جگہ وارد ہے۔

(۲) اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ "اگر تم مومن ہو"

(اَیْ اِیْمَانُکُمْ یَقْتَضِیْ ھٰذَا) (یعنی تمہارے ایمان کا اقتضا یہ ہے)۔

(یہاں جملہ خبریہ کی جگہ جملہ انشائیہ فرمایا گیا ہے۔)

(۳) مِنْ اَجَلِ ذَالِکَ کَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ (۵ : ۳۲)

"اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے لازم کر دیا تھا"

معنی یہ ہیں کہ بنی آدم کے حال پر قیاس کر کے ہم نے یہ لازم کر دیا ہے۔ یا ابن آدم کے حال کی مثال پر قیاس کر کے یہ قانون بنایا ہے۔ مِنْ اَجَلِ ذَالِکَ کو 'مثالِ حال' کی جگہ لایا گیا ہے۔ (جو اس سے سابقہ آیات میں مذکور ہے) کیونکہ قیاس سبب دیکھنے پر ہی ہوتا ہے۔ اس طرح گویا قیاس علت یا سبب ظاہر کرنے کی ایک قسم ہے۔

(۴) اَرَأَیْتَ "کیا تو نے دیکھا (یا کیا تو نے غور کیا)"

یہ اصل میں رُؤْیَتَ سے استفہام ہے۔ کیونکہ شروع میں ہمزہ (أ) استفہامیہ ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ اس اسلوب سے آیندہ کے کلام کو سننے کے لیے ذہن خبردار ہو جائے۔ جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے: کیا تم نے کچھ دیکھا؟ کیا تم نے کچھ سنا؟

تقدیم و تاخیر کی وجہ سے بھی مطلب سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے اور امرِ بعید سے تعلق بھی دشواری کا موجب ہوتا ہے۔

(۱) اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ اِنَّا لَمُنَجُّوْھُمْ اَجْمَعِیْنَ اِلَّا امْرَاَتَہٗ (۱۵ : ۵۹)

"مگر لوط کے لوگ۔ کہ ہم ان سب کو ضرور بچالیں گے' سوا اس کی عورت کے"۔
یہاں دو جگہ اِلَّا فرما کر استثنا کیا گیا ہے۔ اس سے کچھ دشواری پیدا ہوگئی ہے۔

(۲) فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ
"پس کون سی چیز اس کے بعد تجھے جزا کے بارے میں جھٹلاتی ہے"۔
یہ جملہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (ہم نے انسان کو بہتر صورت میں پیدا کیا) سے ملا ہوا ہے۔

(۳) يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ (۲۲ : ۱۳)
"وہ بلاتا ہے (اس کو) جس کا نقصان زیادہ قریب ہے نفع سے"۔
(اَیْ يَدْعُوْا مَنْ ضَرُّهٗ) (یعنی وہ بلاتا ہے اس کو جو اُسے ضرر دے)

(۴) لَتَنُوْٓءُ بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ (۲۸ : ۷۶)
"بوجھ سے جھکا دے ایک طاقت ور جماعت کو"۔
(اَیْ لَتَنُوْٓءُ الْعُصْبَةُ بِهَا)
(یعنی بوجھ سے جھک جائے ایک جماعت اس کے سبب سے)

(۵) وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ (۵ : ۶)
" اور تم مسح کرو اپنے سروں کا' اور اپنے پاؤں کو (دھولو)"
(اَیْ اِغْسِلُوْا اَرْجُلَكُمْ) (یعنی دھولو اپنے پاؤں)
(اس آیت میں پہلے "فَاغْسِلُوْا" کا فعل امر آیا ہے' اس کا مفعول "اَرْجُلَ" (پاؤں) دور واقع ہوا ہے۔ مگر چونکہ مفتوح ہے' اس لیے مفعولی حالت ظاہر ہوتی ہے۔ اگر مجرور ہوتا تو "کسرہ" ہوتا' جیسے بِرُءُوْسِكُمْ کی س پر ہے)

(۶) وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى (۲۰ : ۱۲۹)
"اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے نہ ہو چکی ہوتی تو عذاب لگ جاتا اور ایک مقررہ وقت ہے"۔
(اَیْ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى لَكَانَ لِزَامًا)
(یعنی اگر ایک بات پہلے نہ ہو چکی ہوتی اور وقت مقرر نہ ہوتا تو عذاب آ جاتا)

''اَجَلٌ مُسَمًّی'' اصل میں ''کَلِمَۃٌ سَبَقَتْ'' کے بعد ہے۔ مگر آیت مذکورہ میں دور واقع ہوا ہے۔

(۷) اِلَّا تَفْعَلُوْہُ تَکُنْ فِتْنَۃٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ کَبِیْرٌ (۸: ۷۳)

''اگر تم اسے نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد ہو جائے گا''۔

یہ ''فَعَلَیْکُمُ النَّصْرُ'' سے متصل ہے۔ (ذیلی حاشیے میں پوری آیت دیکھو[1])

(۸) ''اِلَّا قَوْلَ اِبْرَاھِیْمَ'' متصل ہے ''کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْٓ اِبْرَاھِیْمَ'' سے[2]

---

[1] وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ فَعَلَیْکُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰی قَوْمٍۢ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَھُمْ مِّیْثَاقٌ ط وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ط اِلَّا تَفْعَلُوْہُ تَکُنْ فِتْنَۃٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ کَبِیْرٌ۔

اور اگر وہ مدد مانگیں تم سے دین کے معاملے میں تو تم پر مدد کرنا واجب ہے۔ سوا اس کے کہ یہ مدد اس قوم کے خلاف ہو جن کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو دیکھتا ہے اور جو کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اگر تم ایسا کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ وفساد ہو جائے گا۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خط کشیدہ دونوں حصے متصل ہیں مگر یہ ایک دوسرے سے دور واقع ہیں۔ (مترجم)

[2] قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْٓ اِبْرَاھِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِھِمْ اِنَّا بُرَآؤُا مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کَفَرْنَا بِکُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ۔

البتہ تمہارے لیے اچھا نمونہ ہے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے بری ہیں۔ اور ان سے جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کو چھوڑ کر۔ ہم نے تم سے انکار کیا، اور ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے کھلی دشمنی ہے۔ یہاں تک کہ تم صرف اللہ پر ایمان لاؤ۔

اِلَّا قَوْلَ اِبْرَاھِیْمَ لِاَبِیْہِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَکَ وَمَآ اَمْلِکُ لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ ط سوا ابراہیم کے اس قول کے جو اس نے اپنے باپ سے کیا کہ ''میں ضرور بخشش مانگوں گا تیرے لیے اور میں تو اختیار نہیں رکھتا اللہ سے متعلق کچھ بھی۔''

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ خط کشیدہ دونوں حصے ایک سلسلۂ بیان کے ہیں۔ درمیانی کلام اس خطاب کو ظاہر کرتا ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں نے قوم سے کیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے آخری قول کو ''اسوۂ حسنہ'' سے مستثنیٰ کر دیا۔ (مترجم)

(۹) يَسْئَلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا (۷: ۱۸۷)

''وہ تجھ سے پوچھتے ہیں۔ گویا تو بحث کرنے والا ہے اس سے متعلق''۔

(اَیْ يَسْئَلُوْنَكَ عَنْهَا كَاَنَّكَ حَفِيٌّ)

(یعنی وہ تجھ سے اس کے متعلق پوچھتے ہیں گویا تو بحث کرنے والا ہے)

کلام کے مروجہ طریقوں پر زیادتی کئی طرح سے ہوتی ہے کبھی تو صفت سے ہوتی ہے۔

(۱) وَلَا طَائِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ (۶: ۳۸)

''اور نہ پرندہ جو اڑتا ہے اپنے دونوں بازوؤں سے''۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝ (۷۰: ۹-۲۱)[۱]

''بے شک انسان پیدا کیا گیا حریص۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بے صبرا ہو جاتا ہے' اور جب بھلائی پہنچتی ہے تو بخیل ہو جاتا ہے۔''

(۲) کبھی ابدال سے اضافہ ہوتا ہے:

لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ (۷: ۷۵)

''ان لوگوں سے جو کمزور تھے' ان میں سے جو ایمان لایا تھا اُس سے''۔

(خط کشیدہ حصہ ماقبل پر ایک اضافہ ہے۔ مگر مفید مطلب ہے)

کبھی عطفِ تفسیری سے اضافہ ہوتا ہے:

حَتّٰى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً (۴۶: ۱۵)

''یہاں تک کہ جب وہ پہنچتا ہے اپنی بھر پور قوت کو اور پہنچ جاتا ہے چالیس سال (کی عمر) کو''۔

(دوسرا جملہ مفید مطلب اضافہ ہے اور عطف تفسیری کے بعد آیا ہے)

کبھی تکرار سے اضافہ ہوتا ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ (۱۰: ۶۶)

---

۱ ''هَلُوْعًا'' میں بے صبری، بخل، نالہ و فریاد تینوں مفہوم ہیں۔ اس لیے جَزُوْعًا اور مَنُوْعًا کا اضافہ وضاحت اور تشریح کے لیے ہے۔ (مترجم)

''اللہ کو چھوڑ کر شریکوں کو جو لوگ پکارتے ہیں وہ کس چیز کی پیروی کرتے ہیں' وہ صرف خیال کی پیروی کرتے ہیں۔''

اس کی اصل ترکیب یوں ہے:

وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ اِلَّا الظَّنَّ

''نہیں پیروی کرتے ہیں وہ لوگ جو اللہ کے سوا شرکاء کو پکارتے ہیں' مگر خیال کی''۔

اسی طرح اس آیت میں:

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (۲:۸۹)

''اور جب آئی ان کے پاس کتاب اللہ کے پاس سے جو تصدیق کرنے والی ہے اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے اور وہ پہلے ہی فتح کی دعا مانگتے تھے کافروں پر پھر جب وہ چیز آ گئی جسے انہوں نے پہچان لیا تو اس کا انکار کر گئے۔

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ (۴:۹)

''پس چاہیے کہ ڈریں وہ لوگ جو اگر چھوڑ جاتے اپنے پیچھے کمزور بال بچے تو ان کے بارے میں (وہ مرتے وقت) ڈرتے۔ پس اللہ سے ڈریں۔''

(خشیت اور خوف کے ایک ہی معنی ہیں۔ پس ''خافوا'' مکرر آیا ہے۔ مگر مفید مطلب ہے)

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ط قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ (۲:۱۸۹)

''وہ تجھ سے پوچھتے ہیں ہلالوں کے متعلق۔ کہہ دے وہ لوگوں کے لیے مقررہ اوقات ہیں اور حج کے لیے ہیں۔''

یعنی یہ اس اعتبار سے مواقیت ہیں کہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اوقات مقرر کئے' اور حج کا زمانہ معلوم کرنے کا اسے ذریعہ بنایا۔ اگر یہ کہا جاتا کہ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ فِى

حَجِّهِمْ (وہ مواقیت ہیں لوگوں کے لیے ان کے حج کے بارے میں) تو اختصار ہو جاتا ہے[1]

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا وَ تُنْذِرَ یَوْمَ الْجَمْعِ (۴۲:۷)

''تاکہ تو ڈرائے بستیوں کے مرکز کو اور اس کے اطراف کو اور ڈرائے جمع ہونے کے دن سے''۔

(اَیْ تُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی یَوْمَ الْجَمْعِ)

(یعنی تو ڈرائے بستیوں کے مرکز کو جمع ہونے کے دن سے)

(تُنْذِرَ کی تکرار ہے' مگر اس سے وضاحت اور صفائی بیان مقصود ہے(مترجم)

وَتَرَی الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً

''اور تو دیکھتا ہے پہاڑوں کو' خیال کرتا ہے ان کو جامد''۔

(چونکہ ''دیکھنا'' کے اور معنی بھی ہوتے ہیں' اس لئے تَـــرَی (تو دیکھتا ہے) کے بعد ''تَـحْسَبُ ''(تو خیال کرتا ہے) کا اضافہ فرمادیا۔ تاکہ یہ وضاحت ہو جائے کہ یہاں رویت (دیکھنا) سے مراد گمان کرنا' یا خیال کرنا ہے۔)

کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِیْهِ اِلَّا الَّذِیْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنَاتُ بَغْیًاۢ بَیْنَهُمْ فَهَدَی اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (۲:۲۱۳)

''سب لوگ ایک امت تھے۔ پھر اللہ نے نبیوں کو مبشر اور منذر بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب حق اتاری۔ تاکہ فیصلہ کرے لوگوں کے درمیان جن باتوں

---

[1] مَـوَاقِیْـتُ. میقات کی جمع ہے اور یہ اسم آلہ ہے۔ اس کے معنی وقت معلوم کرنے کا ذریعہ۔ چونکہ چاند کے بڑھنے اور گھٹنے سے دن اور مہینے کا حساب لگایا جاتا ہے۔ (یا یہ کہئے کہ تاریخوں کا تعین کیا جاتا ہے) اس لیے اس اعتبار سے اس کا فائدہ عام ہے۔ دوسرا فائدہ اس کا یہ ہے کہ اس کا حساب لگا کر حج کے مہینے اور ایام معلوم کئے جاتے ہیں۔ جس کی اہمیت مسلمانوں میں دینی، تمدنی اور معاشی لحاظ سے ہے، جواب مختصر ہے۔ مگر وسیع المعنی ہے۔ (مترجم)

میں انہوں نے اختلاف کیا ہے۔ اختلاف انہی لوگوں نے کیا تھا جنھیں کتاب برحق دی گئی تھی اور واضح احکام ان کے پاس آئے تھے۔ وہ آپس میں زیادتی چاہتے تھے۔ پس اللہ نے اپنے حکم سے حق کی طرف ان کی رہنمائی کی جو ایمان لائے تھے ان باتوں کے لیے جن میں انہوں نے اختلاف کیا تھا۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔"

(مرتب و منظم عبارت کے درمیان "وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ" داخل کیا گیا ہے۔ تاکہ اِخْتَلَفُوْا کی وضاحت ہو جائے (کہ اختلاف کن لوگوں نے کیا؟) اور یہ معلوم ہو جائے کہ اختلافِ رائے سے ان کا مقصد کیا تھا۔ نبیوں نے جس امت کو دعوت دی، اور کتاب دی اس کے باوجود بعد میں کسی کا ایمان لانا اور کسی کا انکار کرنا "اختلاف" ہی کی بنا پر ہوتا رہا ہے) [1]

بعض وقت فاعل یا مفعول پر حرفِ جر زیادہ کرتے ہیں۔ تاکہ اِس کے ذریعے مفعول اور فعل پر زور و تاکید ہو جائے۔ مثلاً

(۱) يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا (اَیْ تُحْمٰى هِيَ)

"جس دن تپایا جائے گا اُس پر (یعنی تپایا جائے گا اُسے)

(۲) وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ (۵: ۴۶)

"اور ہم نے پیچھے بھیجا اُن کے آثار پر عیسیٰ ابن مریم کو"۔

(اَیْ قَفَّيْنَا هُمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ [2]

(یعنی ہم نے ان کے پیچھے بھیجا عیسیٰ ابن مریم کو۔)

اس جگہ یہ نکتہ جان لینا چاہیے کہ "واؤ" اکثر مقامات پر تاکیدِ اتصال کے لیے آتا ہے بطور حرفِ عطف نہیں۔ جیسے

(۱) اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (۵۶: ۱) "جب آن پڑے گا واقعہ"

---

[1] "فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ" کا سلسلہ "فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ" سے ملتا ہے۔ (مترجم)

[2] گویا عَلٰى اٰثَارِهِمْ بڑھایا گیا ہے۔ مگر یہ اضافہ مفید مطلب ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے کسی نئے عقیدے (یا دین) کی دعوت نہیں دی۔ بلکہ اگلے انبیاء ہی کے دین پر رہے (مترجم)

(۲) وَ کُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً (۵۶:۷) ''تم ہو جاؤ گے تین قسموں میں''

(۳) وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (۳۹:۷۱) ''کھولے جائیں گے اس کے دروازے''

(۴) وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ (۳:۱۴۱) ''تا کہ خالص کر دے اللہ''

(ان میں واؤ تاکیدِ اتصالی کے لیے ہیں۔ عطف کے لیے نہیں۔)

اسی طرح ''ف'' کے متعلق سمجھنا چاہیے۔ قسطلانی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ صفت اور موصوف کے درمیان تاکیدِ اتصال کے لیے حرفِ عاطف کا لانا درست ہے۔ مثلاً:

اِذْ يَقُوْلُ الْمُنَافِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ[۱] فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ۔

''جب کہا منافقوں نے اور انہوں نے جن کے دلوں میں مرض ہے''۔

سیبویہ نے کہا ہے کہ یہ مَرَرْتُ بِزَيْدٍ وَ صَاحِبِكَ (میں زید کے ساتھ گزرا، جو تیرا صاحب ہے) کی طرح ہے۔ کہ اس میں صاحب سے مراد زید ہی ہے۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۔

''اور ہم نے نہیں ہلاک کیا کسی بستی کو مگر اس کے لئے ایک مقررہ قانون تھا'' (یا مقررہ معیاد دی تھی)''۔

اس آیت سے متعلق زمخشری کہتا ہے کہ اس میں ''لَهَا كِتَابٌ مَعْلُوْمٌ (اس کے لئے مقررہ میعاد تھی لفظ قَرْيَه کی صفت ہے۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ صفت اور موصوف کے درمیان واو نہ آئے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ۝ (۲۶:۲۰۸)

''ہم نے نہیں ہلاک کیا کسی بستی کو مگر اس کے لیے ڈرانے والے تھے''۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ پہلی آیت میں واو صفت اور موصوف کے اتصال کی تاکید کے لیے ہے۔ جیسا کہ واو حالیہ آتا ہے۔ اور نہیں بھی آتا۔ کہا جاتا ہے: جَاءَنِيْ زَيْدٌ عَلَيْهِ ثَوْبٌ (زید میرے پاس آیا اس کے بدن پر کپڑا تھا) اور اسی بات کو اس طرح بھی کہا جاتا ہے:

[۱] خلاصہ یہ کہ بعض وقت ''واو'' ''تفسیر یا وضاحت کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ آیت مذکورہ میں ''مُنَافِقُوْنَ'' کے بعد واو تفسیری ہے۔ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ (جن کے دلوں میں بیماری ہے) سے منافقون کی تشریح یا وضاحت ہوگئی۔ (مترجم)

جَآءَ نِیْ زَیْدٌ وَّعَلَیْہِ ثَوْبٌ (زید میرے پاس آیا ایسے حال میں کہ اس کے بدن پر کپڑا تھا)

بعض وقت عبارت میں ضمیروں کے منتشر ہونے سے، اور ایک کلمہ کے دو معنی مراد لینے سے مطلب فہمی میں دشواری ہوتی ہے مثلاً:

وَاِنَّھُمْ لَیَصُدُّوْنَھُمْ عَنِ السَّبِیْلِ وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ مُّھْتَدُوْنَ ۝

''اور بے شک وہ (یعنی شیاطین) ان کو روکتے ہیں راستے سے، اور وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں''۔

(یعنی اِنَّ الشَّیَاطِیْنَ لَیَصُدُّوْنَ النَّاسَ عَنِ السَّبِیْلِ وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ مُھْتَدُوْنَ)

(یعنی شیطان لوگوں کو راستے سے روکتے ہیں اور وہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم ہدایت یافتہ ہیں)

آیت شریفہ میں ھُمْ کی ضمیر کا مرجع ''شیاطین'' ہے۔ اور لَیَصُدُّوْنَھُمْ میں ھُمْ کی ضمیر ''النَّاسَ'' کے لیے ہے۔ اور یَحْسَبُوْنَ میں جو ضمیر مستتر ہے، وہ بھی الناس کی طرف ہے۔ یہ ضمیر کے منتشر ہونے کی مثال ہے۔

سورہ قٓ آیت ۲۳ اور ۲۷ میں ''قَرِیْنُہٗ'' دو بار آیا ہے ایک جگہ قرین سے مراد شیطان ہے، اور دوسری جگہ فرشتہ۔

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ (۲:۲۱۵)[1]

''وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں، کہہ دے جو کچھ مال میں سے تم خرچ کرو''[1]

اور دوسری جگہ ہے:

---

[1] پوری آیت شریفہ یہ ہے:
یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسَاکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ. (۲:۲۱۵)
''وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں۔ کہہ دے جو کچھ تم مال میں سے خرچ کرو تو والدین کے لیے، اقربا، یتامیٰ اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہو''۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲ : ۲۱۹)

''وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں' کہہ دے جو کچھ بڑھا ہوا ہو (ضرورت سے)

پہلی آیت میں مَا ذَا' کَیْفَ (کس طرح) کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ اسی لیے وہاں خرچ کے اقسام کی وضاحت فرمائی ہے۔ اور دوسری آیت میں ضرورت سے زائد مال کا مصرف بتایا گیا ہے۔

اسی طرح ''جَعَلَ'' اور ''شَيْءٍ'' وغیرہ بھی مختلف معنوں میں مستعمل ہیں۔ جعل' کبھی تو خَلَقَ کے معنی میں آتا ہی۔ مثلاً جَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّوْرَ (پیدا کیا تاریکیوں کو اور روشنی کو) اور کبھی ''اعتقاد'' کے مفہوم میں ہوتا ہے۔ جیسے وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ..... والی آیت میں[1]

لفظ ''شَيْءٌ'' کبھی فاعل کی جگہ آتا ہے' اور کبھی مفعول بہٖ یا مفعول مطلق وغیرہ کی جگہ جیسے اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ (کیا وہ پیدا کئے گئے ہیں غیر شے سے) یہاں ''غَيْرِ شَيْءٍ'' سے مراد غیر خالق ہے۔ تو معنی یہ ہوئے کہ کیا وہ بغیر خالق کے پیدا کئے گئے ہیں؟ پس ''شَيْءٍ'' کا استعمال خالق کے لیے ہے۔[2]

(۲) فَلَا تَسْئَلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ (۱۸ : ۷۰)

''پس تو سوال نہ کر مجھ سے کسی چیز سے متعلق''

(یعنی میرے کسی کام سے متعلق جس کے درست ہونے میں تجھے تامل ہو' سوال نہ کر)

کبھی امر ' نَبَأٌ اور خَطْبٌ سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جس کے متعلق کچھ بتایا جا رہا ہو۔ جیسے نَبَأٌ عَظِيْمٌ (بڑی خبر) یعنی عجیب قصہ۔ اسی طرح خَيْرٌ ' شَرٌّ اور ان کے ہم معنی الفاظ مختلف مقامات پر مختلف معنوں میں مستعمل ہیں۔

---

[1] آیت یہ ہے:

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا

اور انہوں نے ٹھہرایا اللہ کے لیے حصہ ان چیزوں میں سے جو (اللہ نے) پیدا کی ہیں کھیتی اور مویشی کی قسم سے اور کہتے ہیں بزعم خود کہ یہ اللہ کے لیے ہے اور یہ ہمارے (ٹھہرائے ہوئے) شرکاء کے لیے ہے۔

[2] غَيْرِ شَيْءٍ کے معنی ''مادی چیز کے بغیر'' (یا خود ہی) کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں آیت کے یہ معنی ہوں گے۔ کیا وہ خود بخود ہی پیدا ہو گئے؟ (مترجم)

''انتشار آیات'' بھی اسی قسم میں داخل ہے۔ مثلاً ایک آیت کا اعلیٰ مقام قصے کے اختتام کے بعد ہوتا ہے مگر اسے اس سے پہلے بیان کر دیا جاتا ہے۔ پھر قصے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

کوئی آیت نزول میں تو مقدم ہوتی ہے' تلاوت میں مؤخر جیسے قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ والی آیت نزول میں مقدم ہے اور سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مؤخر ہے۔ مگر تلاوت میں یہ پہلے آتی ہے۔

کبھی کفار کے قول کے اثناء میں ہی جواب درج کر دیا جاتا ہے۔

مثلاً اس آیت میں:

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ قُلْ اِنَّ الْهُدٰی هُدَی اللّٰهِ اَنْ یُّؤْتٰٓی اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ (۳: ۷۳)[1]

''اور تم نہ ایمان لاؤ مگر اسی پر جس نے تمہارے دین کی پیروی کی ہے۔ کہہ دے بے شک ہدایت' اللہ ہی کی ہدایت ہے۔ کہ دی جائے کسی کو ویسی چیز جو تم کو دی گئی یا وہ حجت کریں تم سے تمہارے رب کے نزدیک''۔

الحاصل ان مباحث پر بہت تفصیل کی ضرورت ہے۔ مگر ہم نے یہ جتنا بیان کیا ہے' اتنا ہی کافی ہے۔ اگر سعادت مند طلبہ ان امور کا مطالعہ کر کے دل نشین کر لیں تو اللہ تعالیٰ کے کلام کو بادنیٰ تامل سمجھ لیں گے' غیر مذکور بات کو مذکور کے ذریعے قیاس کر لیں گے' اور ایک مثال سے دوسری مثال تک ان کا ذہن پہنچ جائے گا۔

---

[1] اس کی ترتیب اصلی یہ ہے: وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ (وَلَا تُؤْمِنُوْا) اَنْ یُّؤْتٰٓی اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۔ قُلْ اِنَّ الْهُدٰی هُدَی اللّٰهِ (یعنی تم ایمان نہ لاؤ مگر اسی پر جس نے تمہارے دین کی پیروی کی ہے۔ (اور یقین نہ کرو) کہ کسی کو وہ چیز دی گئی ہے جو تمہیں دی گئی ہے' یا (اس سے یہ ہوگا کہ) وہ (یعنی مسلمان) حجت لائیں گے تمہارے مقابل اللہ کے نزدیک اس کے بعد آخر میں جواب ہے: قُلْ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ (بے شک ہدایت اصل میں اللہ کی ہدایت ہے۔)
یہ بھی ممکن ہے کہ صرف آخری حصہ (اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ) پہلے حصے سے متصل ہو۔ (واللہ اعلم)
(مترجم)

فصل پنجم

مُحکم، متشابہ، کنایہ، تعریض اور مجازِ عقلی

محکم، اس کلام کو کہتے ہیں جس سے زباں داں صرف وہی مخصوص معنی سمجھ سکے، جس معنی میں وہ کہا گیا ہے۔ مگر اس سمجھنے سے پہلے اعتبار عربوں کا ہے، نہ ہمارے زمانے میں بہت باریکی نکالنے والے عالموں کا جن کی دِقتِ نظری ایک ایسا سخت مرض ہے جس کے ذریعے وہ مُحکم کو متشابہ اور معلوم کو مجہول بنادیتے ہیں۔

متشابہ اس کلام کو کہتے ہیں جس کے دو معنی ہوں۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کہ جملے میں کسی ضمیر کے دو مرجع ہو سکتے ہوں مثلاً کسی شخص نے کہا:

اِنَّ الْاَمِیْرَ اَمَرَنِیْٓ اَنْ اَلْعَنَ فُلَانًا لَعَنَهُ اللّٰهُ

''مجھے امیر نے حکم دیا کہ میں فلاں آدمی پر لعنت کروں، اللہ اس پر لعنت کرے''۔

یہاں اشتباہ ہوا ہے کہ کہنے والے کی مراد ''ضمیر'' سے کون ہے؟ ''فلاں'' ہے یا ''امیر؟''

اشتباہ اس وقت بھی ہوتا ہے جب کلام میں کوئی لفظ ذو معنی ہو۔ مثلاً لَامَسْتُمُ النِّسَآءَ (تم نے چھوا عورتوں کو) مُلَامَسَة کے معنی چھونے کے علاوہ جماع کرنے کے بھی ہیں۔

اشتباہ اس وجہ سے بھی ہوتا ہے جب کلام کے دو لفظوں پر جو قریب و بعید ہوں، عطف کا احتمال ہو۔ مثلاً وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ (اور تم مسح کرو اپنے سروں کا، اور اپنے پاؤں کو)[1]

---

[1] پوری آیت شریفہ یہ ہے: اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ. (۶:۵)

''جب تم کھڑے ہو جاؤ نماز کے لیے تو دھولو اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک اور مسح کرلو سروں کا اور پاؤں کو ٹخنوں تک (دھولو)''

اگر اَرجُلَ حالت مفعولی میں ہے تو اس کا تعلق فَاغْسِلُوْا سے ہے اور اگر اَرجُلِ (لام مکسور) ہے اور حالت جری ہے تو وَامْسَحُوْا سے متصل ہے۔

اس صورت میں بھی اشتباہ ہوتا ہے جہاں عطف بھی ہوسکتا ہو، اور نئے جملے کا آغاز بھی ممکن ہو۔ مثلاً

مَايَعْلَمُ تَاوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ[۱] وَالرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ (۳:۷)

"نہیں جانتا اس کا حقیقی مطلب سوا اللہ کے اور علم میں رسوخ رکھنے والے......

کنایہ، ایسے انداز کلام کو کہتے ہیں جس سے کوئی بات کسی کے لیے ثابت کی جائے اس طرح کہ سننے والے کا ذہن ایسی بات کی طرف منتقل ہو جائے جو قدرتی طور پر عقل کے نزدیک لازم ہو۔ مثلاً کسی شخص کو عظیم الرماد (راکھ کے بڑے ڈھیر والا) کہیں اور اس سے مراد بہت مہمان نواز ہو۔[۲]

اسی طرح يَدَاهُ مَبْسُوْطَتَانِ (اس کے ہاتھ کشادہ ہیں) سے کرم وسخاوت کا مفہوم ذہن میں آتا ہے۔ اسی طرح اپنے دلی خیالات کو محسوسات کے ذریعے ظاہر کرنا بھی کنایہ میں داخل ہے۔ یہ بہت وسیع مضمون ہے۔ عربوں کے اشعار، خطبات، قرآنِ عظیم اور احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کنائے بکثرت ہیں چند مثالوں میں غور کریں۔

۱۔ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ[۳] (۱۷:۶۴)

اور تو ہلّہ بول دے ان پر اپنے سواروں اور پیادوں سے۔"

اس آیت میں ابلیس کو ڈاکوؤں کے سردار سے تشبیہ دی گئی ہے جس طرح ڈاکوؤں کا سرغنہ غارت گری کے وقت اپنے ساتھیوں کو پکارتا اور چھاپہ مارنے کا حکم دیتا ہے، اور کہتا ہے

۱۔ یہ واؤ عطف کا نہیں ہے۔ (گو بظاہر ایسا خیال ہوتا ہے) "اللہ" کے بعد آیت میں وقف لازم ہے۔ اس لیے جملہ وہیں مکمل ہوگیا۔ اس کے بعد "وَالرَّاسِخُوْنَ" سے دوسرا جملہ یوں ہے۔ وَالرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ (اور علم میں راسخ جو لوگ ہیں وہ کہتے ہیں کہ......) (مترجم)

۲۔ کیونکہ جس جگہ راکھ کی کثرت ہوگی، وہاں لکڑی زیادہ جلی ہوگی، یہ علامت ہے زیادہ کھانا پکنے کی اور زیادہ کھانا وہیں پکے گا جس کے ہاں مہمان آئے ہوں۔ اس لیے عرب میں مہمان نواز کو "کثیر الرماد" یا عظیم الرّماد کہتے تھے۔

۳۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خطاب ابلیس سے ہے۔

ادھر سے آ ؤ، اور ادھر سے گھیرو، (اسی طرح شیطان مختلف طریقوں سے رہزنی کرتا ہے)

۲۔ جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِیَ اِلَی الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ. وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (۳۶:۸/۹)

''ہم نے ڈال دیے ان کی گردنوں میں طوق تو وہ ٹھوڑیوں تک ہیں، اور وہ سر اٹھائے ہوئے ہیں اور ہم نے ان کے آگے اور پیچھے دیوار بنا دی ہے اور ان کو ڈھانک دیا ہے، اس لیے وہ نہیں دیکھتے ہیں۔''

یہاں قرآنی آیات میں کافروں کے غور و تدبر نہ کرنے کو ایسے آدمیوں سے تشبیہ دی گئی ہے، جن کے گلوں میں بھاری طوق پڑے ہوں، اور اوپر سر نہ اٹھا سکتے ہوں، اور ان کے چاروں طرف دیواریں ہوں۔ اور باہر نہ دیکھ سکتے ہوں۔

۳۔ وَاضْمُمْ اِلَیْکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّهْبِ (۲۸:۳۲)

اور ملا لے اپنی طرف اپنے بازو کو خوف کی حالت میں۔

''یعنی خاطر جمع رکھ اور پریشان نہ ہو۔''[1]

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ کسی شخص کی بہادری کا بیان کرنا ہوتا ہے تو تلوار کے ایک دو ہاتھ اِدھر اُدھر گھما کر بتاتے ہیں کہ وہ یوں تلوار چلاتا ہے (گو اس نے عمر بھر تلوار نہ چلائی ہو) اس سے مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ وہ شخص بہادری میں یکتائے زمانہ ہے۔ کبھی کوئی کسی کا مقولہ بیان کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ۔ ''دنیا میں کوئی بہادر میرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔''

بعض وقت کوئی شخص کسی جنگجو کی ہیئت و صورت کی نقل اتارتا ہے جبکہ وہ غالب آچکا ہو اور اس کی فتح مندی کا اظہار کرتا ہے حالانکہ اس نے کبھی جنگ نہیں کی۔

یا کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں نے میرا گلا دبایا، اور میرے حلق سے لقمہ نکال لیا۔

اس طرح کے انداز بیان کو تصویر کشی سے تعبیر کرتے ہیں۔ (اَسے ''اظہارِ خیال بذریعہ محسوسات'' بھی کہہ سکتے ہیں۔)

---

[1] پرندہ خوف کے بعد حالت امن میں ہوتا ہے تو اپنے بازو اپنے بدن سے ملا لیتا ہے۔ اس رو سے یہ محاورہ بنا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی خوف کا موقع ہو تو اس میں بھی تو نہ گھبرا۔ مطمئن رہ۔ (مترجم)

تعریض: یہ ہے کہ کوئی عام بات کہیں مگر اس سے مقصود کسی شخص کا حال بیان کرنا ہو، یا کسی شخص کو تنبیہ کرنا ہو۔

بعض اوقات سلسلۂ مضمون میں اس شخص کی بعض خصوصیات بیان کر دیتے ہیں، اور مخاطب کو اس شخص سے مطلع نہیں کرتے۔ ایسے مقامات میں قرآن مجید پڑھنے والا قصے کا منتظر و محتاج رہتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کے فعل پر ناپسندیدگی کا اظہار فرماتے تو ارشاد ہوتا۔ ''کیا حال ہے ان لوگوں کا جو ایسا کام کرتے ہیں؟'' اسی طرح قرآن مجید کی یہ آیت ہے۔

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ. (۳۳: ۳۶)

''کسی مومن اور مومنہ کے لیے مناسب نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی امر کا فیصلہ کر دیں تو ان کو اپنے معاملہ میں اختیار رہے۔''

اس آیت شریفہ میں حضرت زینبؓ اور حضرت زیدؓ کے واقعے کی طرف اشارہ ہے اور ذیل کی آیت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف:

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْۤا اُولِى الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (۲۴: ۲۲)

''اور تم میں فضل اور مقدور والے لوگ قسم نہ کھا بیٹھیں کہ وہ قرابت داروں، مسکینوں اور مہاجروں کو اللہ کی راہ میں نہیں دیں گے۔ ان کو چاہیے کہ معاف کر دیں اور درگزر کریں کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تم کو بخش دے اور اللہ تو بڑا بخشنے والا اور رحم والا ہے۔''[۱]

---

[۱] مدینے میں ایک غریب مہاجر حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کا قرابت دار تھا۔ وہ اس غریب کی امداد کیا کرتے تھے۔ واقعۂ افک کے موقعہ پر اس سے ناشائستہ غلطی سرزد ہوگئی۔ حضرت صدیق اکبرؓ کو بڑا رنج ہوا۔ آپ نے امداد بند کر دی۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی، جسے سن کر حضرت صدیقؓ نے بدستور امداد جاری کر دی۔

اس آیت شریفہ سے مقصود یہ ہدایت کرنا ہے کہ اقربا، مساکین اور مہاجرین کی امداد میں ذاتی رنج و ملال کو دخل نہ ہونا چاہیے۔ (مترجم)

ایسی صورتوں میں جب تک قصہ اور واقعہ نہ معلوم ہو مطلب واضح نہیں ہوتا۔

مجازِ عقلی یہ ہے کہ کلام میں کسی فعل کو ایسے شخص کی طرف منسوب کریں جو حقیقت میں اس کا فاعل نہیں ہے اور ایسی چیز کو مفعول بنائیں جو اصل میں مفعول بہ نہیں ہے۔ ان دونوں کے درمیان کسی مشابہت کے تعلق کی وجہ سے ایسا کہا جاتا ہے۔ کہنے والا گویا اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ بھی اسی شمار میں ہیں۔ اور اسی جنس سے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے: ''امیر نے محل بنایا'' حالانکہ بنانے والے معمار ہوتے ہیں۔ اسی طرح کہا جاتا ہے: بہار نے سبزہ اگایا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

باب سوم

قرآن مجید کے اسلوبِ بدیع

اس باب میں تین فصلیں ہیں

پہلی فصل

ترتیب وتدوین:

قرآن مجید کو عام کتابوں کی طرح ابواب وفصول میں مرتب نہیں کیا گیا ہے کہ ہر مضمون کسی خاص باب یا فصل میں مل جائے بلکہ اس کتاب کو مکتوبات کا ایک مجموعہ سمجھنا چاہیے۔ جس طرح ایک بادشاہ اپنی رعایا کو حسبِ اقتضائے حال کوئی فرمان لکھ بھیجتا ہے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد دوسرا فرمان، اس کے بعد کوئی اور فرمان، علی ہٰذا القیاس۔ اس طرح بہت سے فرمان جمع ہو جاتے ہیں، تو کوئی شخص ان کا مجموعہ مرتب کر دیتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے حسبِ اقتضائے حال قرآن مجید کی سورتیں یکے بعد دیگرے نازل فرماتا رہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانے میں ہر ایک سورۃ محفوظ و مرتب تھی۔ ساری سورتیں ایک جگہ جمع نہیں کی گئی تھیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں تمام سورتیں بہ ترتیبِ خاص ایک جلد میں جمع کر دی گئیں اور اس مجموعہ کا نام ''مُصحَف'' رکھا گیا۔

صحابہؓ کے نزدیک سورتیں پانچ اقسام پر منقسم تھیں؟

۱۔ طوال: سب سے بڑی سورتیں۔

۲۔ مئین: وہ سورتیں جن میں سو یا اس سے کچھ زیادہ آیتیں ہوں۔

۳۔ مثانی: وہ سورتیں جن میں سو سے کم آیتیں ہوں اور

۴۔ مفصل۔

۔۔ مصحف کی ترتیب میں دو تین سورتیں جو مثانی کی قسم کی تھیں وہ مئین میں داخل کر دی گئیں۔ اس لیے کہ ان کا سیاق مئین کے سیاق سے مناسبت رکھتا تھا۔ علی ہذا القیاس۔ بعض اقسام میں کچھ اور تصرف کیا گیا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس مصحف کے مطابق چند مصاحف لکھوائے اور اطراف میں بھجوائے تا کہ مسلمان ان سے استفادہ کریں اور کسی دوسری ترتیب کی طرف مائل نہ ہوں۔

چونکہ سورتوں کے اسلوب اور شاہی فرامین کے اسلوب میں پوری مناسبت ہے۔ اس لیے سورتوں کی ابتدا اور انتہا میں مکتوبات کے طریقے کی رعایت رکھی گئی ہے۔ چنانچہ بعض مکتوبات کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد سے کیا جاتا ہے۔ بعض کی ابتدا عرضِ بیان سے کی جاتی ہے بعض کاتب یا مکتوب الیہ کے نام سے شروع کیے جاتے ہیں اور بعض رقعات بغیر عنوان کے ہوتے ہیں۔ بعض طویل ہوتے ہیں اور بعض مختصر۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بعض سورتوں کو حمد یا تسبیح سے شروع کیا ہے، بعض کو بیانِ غرض سے، جیسا کہ فرمایا ہے:

۱۔ ذَالِكَ الْكِتَابُ لَارَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (۲:۱)

''یہ وہ کتاب ہے جس میں شک نہیں رہنمائی ہے متقیوں کے لئے۔''

۲۔ سُوْرَةٌ اَنْزَلْنَا هَاوَ فَرَضْنَاهَا (۲۴:۱)

''یہ ایک سورت ہے جسے ہم نے اتارا اور اس پر عمل کو ہم نے فرض قرار دیا۔''

''یہ آغاز اسی طرح کا ہے جس طرح دستاویزوں میں لکھا جاتا ہے کہ: ''یہ تحریر ہے جس پر فلاں فلاں نے مصالحت کی۔'' یا ''یہ وہ تحریر ہے جس کی فلاں نے وصیت کی۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے موقع پر لکھایا تھا: هٰذَا مَا قَاضٰى عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ (صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی یہ وہ تحریر ہے جس پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فیصلہ کیا۔

قرآن مجید کی بعض سورتیں مُرسل اور مُرسل الیہ کے ذکر سے شروع ہوتی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ (۳۹:۱)

"اس فرمان کا صدور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے جو بہت زبردست اور بہت حکمت والا ہے۔"

۲۔ كِتٰبٌ اُحۡكِمَتۡ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَكِيۡمٍ خَبِيۡرٍ (۱۱:۱)

"یہ کتاب ہے جس کی آیتیں محکم (اٹل) ہیں پھر تفصیل کی گئی ہے۔ یہ بہت حکمت والے اور خوب خبر رکھنے والے کی جناب سے ہے۔"

یہ اسی طرح ہے جس طرح یہ لکھا جاتا ہے کہ "فلاں کی بارگاہِ خلافت سے حکم صادر کیا جاتا ہے" یا یہ کہ "فلاں شہر کے باشندوں میں بارگاہِ خلافت کی طرف سے اعلان کیا جاتا ہے" یا جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکتوب میں تحریر فرمایا تھا:

مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ اِلٰى هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ "

"یہ خط محمد رسول اللہ کی طرف سے روم کے بڑے آدمی ہرقل کو۔

جو سورتیں رقعوں اور چٹھیوں کے طرز پر بغیر عنوان کے ہیں، وہ اس طرح شروع ہوتی ہیں:

۱۔ اِذَا جَآءَكَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ (۶۳:۱)

"جب آئیں تیرے پاس منافق لوگ۔"

۲۔ قَدۡ سَمِعَ اللّٰهُ قَوۡلَ الَّتِىۡ تُجَادِلُكَ فِىۡ زَوۡجِهَا (۵۸:۱)

"اللہ نے اس (عورت) کی بات سن لی جو تجھ سے جھگڑتی تھی اپنے خاوند کے معاملے میں۔"

۳۔ يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (۶۶:۱)

اے نبی، کیوں حرام کرتا ہے اس کو جو اللہ نے حلال کیا ہے تیرے لیے۔

عرب کی فصاحت مشہور ہے۔ اس کا نمونہ ان کے قصائد ہیں۔ وہ اپنے قصائد کی تشبیب (یا تمہید) میں عجیب مقامات اور ہولناک واقعات کا ذکر کرتے تھے۔ اللہ نے بعض سورتوں میں اس اسلوب کو اختیار فرمایا۔ چنانچہ ایک سورہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا فَالزّٰجِرٰتِ زَجۡرًا (۳۷:۲)

"گواہ رہیں صف باندھی ہوئی (جماعتیں) پھر آواز کرنے والی۔"

اور ایک سورہ اس طرح:

وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا ۙ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۙ (۵۱ : ۲)

''گواہ رہیں اڑا کر پھیلانے والیاں اور بوجھ اٹھانے والیاں۔''

اور ایک سورہ اس طرح:

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۙ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۙ (۸۱ : ۲)

''جب سورج لپیٹ لیا جائے گا، اور جب ستارے ماند پڑ جائیں گے۔''

جس طرح مکتوبات یا فرامین کے خاتمہ پر جامع کلمات اور نادر نصیحتیں لکھی جاتی ہیں اور احکاماتِ سابقہ پر عمل کی تاکید اور ان کے خلاف کرنے والے کو تہدید کی جاتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی سورتوں کے آخر میں جامع کلمات اور حکمت کے سرچشمے دے کر ختم فرمایا ہے۔ ان پر عمل کی تاکیدِ بلیغ فرمائی ہے اور ان کے برخلاف عمل کرنے والوں کو ڈرایا دھمکایا ہے۔

کبھی سورت کے درمیان ہی کوئی بہت ہی بلیغ، نہایت مؤثر و مفید کلام ایک عجیب انداز و اسلوب سے شروع ہو جاتا ہے۔ جو یا تو حمد و تسبیح پر مشتمل ہوتا ہے یا انعام و احسان پر۔ مثلاً سورہ النمل کی آیت ۵۹ یہ ہے۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ.

''کہہ، سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے اور سلامتی ہے اس کے ان بندوں پر جنہیں اس نے برگزیدہ کیا۔ کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جنہیں وہ شریک بناتے ہیں؟''

اس کے بعد پانچ آیتوں میں نہایت بلیغ انداز اور مؤثر اسلوب میں شرک کی تردید فرمائی اور توحید کو ثابت کیا ہے۔[1]

---

[1] وہ پانچ آیات شریفہ یہ ہیں:

(۱) اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ

''بھلا کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو، اور تمہارے لیے ابر سے پانی برسایا، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اسی طرح سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل سے مناظرہ کا آغاز اس طرح کیا ہے:"

يٰبَنِیٓ اِسْرَآئِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِیٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ۔

"اے بنی اسرائیل یاد کرو میری نعمت کو جو میں نے تمہیں عطا کی تھی۔"

اور آگے جا کر ختم بھی اسی کلمہ پر کیا ہے۔ مناظرہ کا آغاز جس کلام سے ہو، اسی کلام سے اسے ختم کرنا بہت بلند درجے کی بلاغت ہے۔ ایسے ہی سورہ آل عمران کے ابتدائی حصے میں اہلِ کتاب سے مناظرہ اس آیت سے شروع فرمایا ہے: اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَام (بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے) اس سے مقصد یہ ہے کہ پہلے موضوعِ بحث کی تعیین ہو جائے۔ پھر اسی مدعا پر گفتگو ہو۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِحَقِيْقَةِ الْحَالِ۔

(پچھلے صفحہ سے بقیہ) پھر اس سے خوشنما باغات اگائے۔ تمہارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ان کے درخت اگاؤ۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ بلکہ یہ لوگ ایک طرف کو جھک رہے ہیں۔"

(۲) اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۝

"بھلا کس نے زمین کو ٹھہرنے کے لائق بنایا؟ اور اس کے شگافوں میں نہریں بنائیں اور اس میں پہاڑ کھڑے کر دیے اور دو دریاؤں کے درمیان روک بنائی کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ بلکہ ان میں اکثر علم نہیں رکھتے۔"

(۳) اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۔

"بھلا کون جواب دیتا ہے مجبور و بے کس کو جب وہ اسے پکارتا ہے۔ اور تکلیف کو دور کرتا ہے اور تم کو زمین کا وارث بنا دیتا ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ اور کوئی معبود ہے؟ تم بہت کم نصیحت لیتے ہو۔"

(۴) اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۝

"بھلا کون تمہیں زمین اور سمندر میں راستہ دکھاتا ہے؟ اور کون ہواؤں کو بھیجتا ہے اپنی رحمت کے آگے خوشخبری بنا کر۔ کیا اللہ کے ساتھ اور کوئی معبود ہے؟ اللہ اس سے برتر ہے جسے وہ شریک بناتے ہیں۔"

(۵) اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝

"بھلا کون پیدائش کی ابتدا کرتا ہے؟ پھر اسے لوٹاتا ہے۔ اور کون تم کو آسمان سے اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ اور کوئی معبود ہے؟ کہدو لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔"

دوسری فصل

آیات کی ہیئتِ ترکیبی

جس طرح قصائدِ ابیات پر مشتمل ہوتے ہیں' اسی طرح اللہ تعالی کا کلام (اکثر سورتوں میں) آیات پر مشتمل ہوتا ہے۔ مگر آیات وابیات میں فرق ہے۔ یہ دونوں اچھے لہجے میں سنائے جانے کے لائق ہوتی ہیں۔ اور ان سے سننے اور سنانے والے حظ ولذّت حاصل کرتے ہیں۔ لیکن ابیات قواعدِ عروض وقوافی کی پابند ہوتی ہیں جنھیں خلیل نحوی نے مدوّن کیا ہے' اور جن کی پابندی عام شعراء کرتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں آیات کی بنیاد "اجمالی وزن و قافیہ" پر ہوتی ہے جو امرِ طبعی (یا امرِ فطری) سے بہت مشابہ ہے۔ عروضیوں کے افاعیل تفاعیل اور ان کے بنائے ہوئے قوانی سے اسے نسبت نہیں۔ یہ چیزیں صناعی واصطلاحی ہیں۔ آیات وابیات میں جو چیز مشترک ہے وہ نشید[1] ہے۔ اس کی تحقیق کے بعد ہم ان امور پر تفصیل سے بحث کریں گے جن کا التزام آیاتِ قرانی میں کیا گیا ہے۔

فطرتِ سلیم موزوں ومقفّی قصائد اور دلآویز رجز یہ اشعار سے لطف اندوز ہوتی ہے اور حلاوت حاصل کرتی ہے۔ اس کا سبب غور کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس کلام کے اجزا میں موافقت ہوتی ہے (یا جس کی بندش چست ودرست ہوتی ہے) مخاطب کا دل اسے سن کر مزا لیتا' اور اس کے بعد مزید کلام سننے کا منتظر ہو جاتا ہے۔ جب اس سلسلے کا دوسرا شعر اسی موافقت کا سنا دیا جاتا ہے' اور اس کی حالتِ منتظرہ ختم ہو جاتی ہے' تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اور اگر دونوں بیت قافیے میں یکساں ہوں تو لذّت سہ چند ہو جاتی ہے۔

---

[1] نَشِید: اشعار یا موزوں کلام کو آواز بلند پڑھنا یا سنانا۔

انسان کی فطرتِ قدیم کا یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر اسے اشعار سے لذت حاصل ہوتی ہے۔ معتدل ممالک کے مذاقِ سلیم رکھنے والے لوگ اس اصول پر متفق ہیں۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ شعر کے موزوں اجزاء اور قوافی کی شرطوں سے متعلق ہے۔ ان امور میں ہر ملک کا ایک علیحدہ مسلک ہے۔ اہلِ عرب کے نزدیک جو قواعد مسلم ہیں، ان کی تشریح خلیل نحوی نے کی ہے۔ ہندوؤں کے ہاں کچھ اور ہی طریقہ رائج ہے۔ جو اُن کے ذوق وسلیقے سے مناسبت رکھتا ہے۔ علیٰ ہذالقیاس۔ ہر زمانے کے لوگوں نے شعر گوئی کا ایک خاص طرز اختیار کیا ہے اور اسی پر چلتے رہے ہیں۔ اگر مختلف اقوام کی مختلف رسوم وعادات میں ایک جامع ومشترک چیز کی جستجو کی جائے تو معلوم ہوگا کہ سب کے یہاں کلام کے الفاظِ ترکیب میں ایک تخمینی موافقت پائی جاتی ہے۔ مثلاً عرب **مستفعلن** کی جگہ **مفاعلن** اور **مفتعلن** لے آتے ہیں۔ اور **فاعلا تن** کے بجائے **فعلاتن** اور **فاعلاتن** کو با قاعدہ سمجھتے ہیں۔ ایک بیت کے ہم آہنگ دوسری بیت لاتے ہیں، ایک بیت کے عروض کو دوسری بیت کے عروض میں رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ حشو میں بکثرت زحافات کو جائز سمجھتے ہیں۔ مگر فارسی کے شعراء زحافات کو معیوب سمجھتے ہیں۔ اسی طرح عرب کے شعراء کے نزدیک کسی بیت میں **قبورًا** کا قافیہ **منیرًا** لانا مستحسن ہے۔ مگر شعرائے عجم اس کے خلاف ہیں۔ شعرائے عرب برخلاف شعرائے عجم کے حاصل، داخل، نازل کو ایک ہی قسم میں شمار کرتے ہیں۔ عرب شعراء کے نزدیک اگر ایک کلمہ کا آدھا حصہ مصرع اوّل میں اور دوسرا آدھا دوسرے مصرع میں شامل ہو جائے تو کوئی قباحت نہیں۔ مگر شعرائے عجم اسے ناجائز سمجھتے ہیں۔

غرض امرِ مشترک میں موافقت (جس سے سننے والا محظوظ ہوتا ہے) سے مراد ایک تخمینی موافقت ہے۔ حقیقی موافقت مراد نہیں۔ غور کرو، ہندوؤں نے اپنے اشعار کے اوزان کی بنیاد حروف کی تعداد پر رکھی ہے۔ وہ وزن میں حرکات وسکنات کا لحاظ نہیں رکھتے۔ مگر پھر بھی ان کے گیت سننے سے لذّت حاصل ہوتی ہے۔ ہم نے دہقانیوں کے گیت سنے ہیں جنھیں وہ لذت حاصل کرنے کے لیے گاتے ہیں۔ ان کے گیتوں میں ردیف کے ساتھ ''تخمینی موافقت'' ہوتی ہے۔ خواہ کسی ٹکڑے میں ایک لفظ کم ہو، کسی میں ایک لفظ زیادہ، مگر وہ گانے کی لے میں ٹھیک کر لیتے اور قصائد کی طرح سنا دیتے اور لذت حاصل کرتے ہیں۔

حاصل یہ کہ ہر قوم کی نظم کا ایک خاص اسلوب ہوتا ہے۔ اور سب قوموں میں دلکش آوازوں

اور دلفریب نغموں سے محظوظ ہوتی ہیں۔ مگر گانے کے طریقے اور اس کے قاعدے مختلف ہیں۔ یونانیوں نے اس کے کچھ اوزان مقرر کیے جن کا نام ''مقامات'' رکھا۔ ان مقامات سے آوازیں اور آوازوں کی شاخیں نکالیں، اور اس طرح ایک مستقل و مبسوط فن مدوّن کر لیا۔ اہلِ ہند نے چھ راگ بنائے، اور ان سے کئی راگنیاں نکالیں۔ مگر ہم نے دیہاتیوں کو دیکھا ہے، جو ان اصطلاحوں سے قطعاً ناواقف ہیں۔ مگر اپنے سلیقے اور ذوق سے خود ہی حسبِ منشا چند اوزان، راگنی، سُر اور تال ایجاد کر کے گیت گاتے اور سناتے ہیں، محفل کو گرماتے ہیں اور لذت حاصل کرتے ہیں۔

پس جب ہم ان اختلافات کو دیکھتے اور غور کرتے ہیں تو امرِ مشترک صرف ''تخمینی موافقت'' ہی کو پاتے ہیں۔ عقل کی نظر صرف ''اجمالی امر'' پر ہے۔ قوافی و ردیف کی تفصیل سے اسے بحث نہیں۔ ذوقِ سلیم تو صرف لطف و حلاوت کا خواہاں ہے۔ اسے بحرِ طویل اور مدید سے کیا سروکار!

جب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس مشتِ خاک، انسان سے ہم کلام ہو تو اس نے اسی ''اجمالی حسن'' کی رعایت فرمائی۔ ان قواعد کو ملحوظ نہیں رکھا جنھیں ایک قوم پسند کرتی ہے تو دوسری قوم پسند نہیں کرتی۔

جب مالک الملک (تعالیٰ شانہ) نے آدمیوں کی روش پر کلام کرنا چاہا تو اس نے اسی اصل بسیط (یا خالص و مفرد اصل قاعدے) پر اپنا کلام مرتب فرمایا۔ ان قواعد پر نہیں جو زمانے اور مذاق کے ساتھ ساتھ ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اصطلاحی قواعد کی پابندی سے کلام میں ''حُسنِ اجمالی'' نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ اور جو ایسا کرتا ہے، وہ گویا اپنے عجز و جہل کا اظہار کرتا ہے۔ کلام کے ہر رنگ میں اور بیان کے نشیب و فراز میں اصطلاحی قواعد کے استعمال کے بغیر ''حسنِ اجمالی'' پیدا کرنا بے شک معجزہ ہے، اور انسان کے حدِ اختیار سے باہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہی طریقہ استعمال فرمایا ہے۔ اس سے ہمارا ذہن ایک قاعدے کی طرف منتقل ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اکثر سورتوں میں آواز کے امتداد کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ بحرِ طویل اور بحرِ مدید کا نہیں۔ نیز فاصلوں میں حرفِ مدہ پر سانس کے منقطع ہونے کی رعایت رکھی ہے، یا جس پر مدہ ہو اس کا لحاظ کیا ہے۔ فنِ قوافی کو مدِ نظر نہیں رکھا ہے۔ اس کلیہ قاعدے کی تفصیل طویل ہوگی۔ یہاں بہت اختصار کے ساتھ کچھ لکھا جاتا ہے:

زخرے میں سانس کی آمدورفت ایک جبلی خاصیت ہے۔ اگرچہ سانس کی درازی و کوتاہی ایک حد تک آدمی کے اختیار میں ہے، لیکن اگر اسے طبعی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو اس کا ایک خاص طول ہوگا۔ پہلی بار سانس لینے میں ایک فرحت حاصل ہوتی ہے، اور وہ بتدریج زائل ہو جاتی ہے، پھر دوسرا سانس لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سانس کی یہ درازی ایک مبہم حد میں محدود ہے۔ اور اس کی ایسی منتشر مقدار معین ہے کہ دو لفظوں کی کمی بیشی اس حد کی تہائی اور چوتھائی مقدار سے متجاوز نہیں ہو پاتی۔ اس میں اوتاد[1] و اسباب کی تعداد میں فرق بھی ہو سکتا ہے۔ اور بعض ارکان کی تقدیم کی بھی گنجائش ہے۔

پس سانس کے اسی امتداد کو اللہ تعالیٰ نے وزن قرار دیا ہے اور اس کی تین قسمیں کی ہیں: طویل، متوسط، اور قصیر۔ طویل کی مثال سورہ نسآء، متوسط کی مثال سورۂ اعراف و انعام، اور قصیر کی مثال سورۂ شعراء اور دخان ہیں۔ سانس کا اختتام ایسے حرف مدہ پر رکھا گیا ہے جو ایک وسیع قافیے کی صورت پر ہو۔ جو ذوقِ طبعی کے موافق ہو، اور اس کی تکرار سے لطف و لذت حاصل ہو۔ اگرچہ وہ حرف مدہ[2] کہیں الف، کہیں واوَ اور کہیں یَ ہو۔ اور گو آخری حرف کہیں یَ، کہیں جَ اور کہیں ق ہو۔

اس قاعدے کی رو سے یَعۡلَمُوۡنَ. مُؤۡمِنِیۡنَ اور مُسۡتَقِیۡم باہم موافق ہیں۔ اور خروج مریج، تَحِیۡد، تبار، فواق، عُجَاب سب با قاعدہ ہیں۔ اسی طرح کلام کے آخر میں الف کا آنا بھی ایک وسیع قافیہ کا موجب ہو سکتا ہے۔ اس کی تکرار بھی لطف انگیز ہوگی۔ اگرچہ حرف روی[3] مختلف ہو۔ جیسے ایک جگہ کریما آئے۔ دوسری جگہ حدیثا تیسری جگہ بَصِیۡرا ہو۔ اگر حروف روی کی موافقت کا التزام اس موقع پر کیا جائے تو گویا خود کو ایک غیر لازم چیز کا پابند بنانے کے مترادف ہوگا۔ جیسا کہ سُورۂ مریم اور سُورۂ فرقان کی ابتدا میں نظر آتا ہے۔

---

[1] علم عروض کی اصطلاح میں دو حرفی لفظ کو سبب، اور سہ حرفی لفظ کو وتد کہتے ہیں۔

[2] حروف علت (و۔ا۔ی) میں سے کوئی حرفِ علت جب ساکن ہو اور اس سے پہلے کے حرف پر حرکت اس کے موافق ہو (واوَ کے موافق ضمہ، الفَ کے موافق فتحہ، اور یَ کے موافق کسرہ ہوتا ہے) تو وہ مدہ کہلاتا ہے۔ مثلاً یقول میں واو ساکن ہے اور اس کے ماقبل حرف (ق) پر ضمہ ہے جو واوؐ کے موافق ہے۔

[3] قافیے کا اصلی حرف روی کہلاتا ہے۔ یہ ہمیشہ ہر قافیے میں آتا ہے۔ اس سے پہلے کا حرف "ردف" کہلاتا ہے۔ یہ حرف مدہ ہوتا ہے۔ (مکَان کا قافیہ زمَان ہے، ان میں نَ روی ہے اور الف مدہ یا ردف ہے) (مترجم)

اسی طرح آیات کا توافق کسی ایک حرف میں، مثلاً سورۂ محمد کی آیات میں آخری حرف میم، اور سورہ الرحمٰن میں نون کا التزام ہے۔ جو لطف کا فائدہ دیتا ہے۔

اسی طرح کلام کے درمیان بار بار ایک مخصوص جملہ لانا بھی لطف سے خالی نہیں۔ مثلاً سورۂ شعراء، سورہ قمر، سورۂ الرحمٰن اور سورۂ مرسلات میں تلاوت کے دوران ہم دیکھتے ہیں۔[1]

کبھی سننے والے کے ذہن کو تازگی و تفریح دینے کے لیے سورتوں کی آخری آیات میں (تخمینی قوافی کی) صورت بدل دی جاتی ہے۔ مثلاً سورہ مریم کی آخری آیات میں اِدًّا اور هَدًّا اور سورہ فرقان میں سَلَامًا اور کِرَامًا، اور سورۂ ص کے آخری رکوع میں طِینٍ، سَاجِدِینَ اور مُنْظَرِینَ لائے گئے ہیں، حالانکہ ان سورتوں کی ابتدا میں آیات کے اختتامی کلمات کی صورتیں ان سے مختلف ہیں۔

اکثر سورتوں میں وزن اور قافیے کی رعایت کو اہم سمجھا گیا ہے جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہے۔ آیت کے آخر میں اگر کوئی لفظ قافیہ بننے کے لائق ہوتا ہے تو اسے قافیہ بنا دیا جاتا ہے، ورنہ اسے کسی ایسے جملے سے ملا دیا جاتا ہے جس میں اللہ کی نعمتوں کا بیان ہو، یا مخاطب کے لیے تنبیہ ہو۔ مثلاً:

وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ (اور وہ بہت حکمت والا اور خوب خبر رکھنے والا ہے) وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيمًا حَكِيمًا (اور اللہ بہت علم اور بڑی حکمت والا ہے) وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (اور اللہ تعالیٰ خوب خبر رکھنے والا ہے ان کاموں کی جو تم کرتے ہو۔) لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (تاکہ تم تقویٰ کرو) إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ (بے شک اس میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے)۔ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں) ایسے مقامات میں کہیں کسی قدر اطناب سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً وَاسْئَلْ بِهٖ خَبِيرًا (اور پوچھ اس کے بارے میں کسی خبر رکھنے والے

[1] سورۃ الشعراء میں بار بار یہ جملہ آتا ہے: إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ○ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ○
اور سورۃ القمر میں: فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ○ اور سورۃ الرحمٰن میں فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ اور سورۃ المرسلات میں: وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ کی تکرار ہے۔ (مترجم)

ہے) کہیں تقدیم و تاخیر ہوتی ہے اور کہیں قلب و زیادتی مثلاً الیاسین (بجائے الیاس) اور طُوْرِ سِیْنِیْنَ (بجائے طورِ سینا)

یہ جاننا چاہیے کہ ضرب المثل آنے سے یا تکرارِ آیات سے کلام میں روانی اور سہولت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس سے طویل کلام چھوٹے کلام کے ہموزن بن جاتا ہے بعض وقت پہلا فقرہ بعد کے فقرے سے چھوٹا ہوتا ہے تو اس سے کلام میں شیرینی و حلاوت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً (سورۃ الحاقۃ میں ہے) خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ (اسے پکڑو پھر اسے طوق پہناؤ)

ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ (پھر اسے دوزخ میں ڈال دو)

ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ (پھر اسے ایسی زنجیر میں ڈال دو جس کی ناپ ستر ہاتھ ہے)

ایسے کلام سے متکلم کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ پہلے اور دوسرے فقرے بحیثیت مجموعی ایک پلّے میں ہوں، اور تیسرا فقرہ تنہا دوسرے پلّے میں ان کے برابر رہے۔ اسی طرح کبھی آیت تین اجزا والی ہوتی ہے۔ مثلاً

یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ
فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ
جس دن سفید ہوں گے کئی چہرے اور سیاہ ہوں گے کئی چہرے تو جن لوگوں کے
چہرے سیاہ ہوں گے۔
وَاَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ......[1]
اور جن لوگوں کے چہرے سفید ہوں گے۔

---

[1] پوری آیتیں حسب ذیل ہیں:
یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ○ وَاَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○
"جس دن سفید ہوں گے کئی چہرے اور سیاہ ہوں گے کئی چہرے۔ تو جن کے چہرے سیاہ ہوں گے (ان سے کہا جائے گا) کیا تم نے کفر کیا تھا اپنے ایمان کے بعد؟ تو چکھو عذاب اس کا جو تم کفر کرتے تھے۔ اور جن کے چہرے سفید ہوں گے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

ایسی صورت میں پہلے جزو کو دوسرے جزو کے ساتھ ملا دیتے ہیں' پھر دونوں کے متعلق یکے بعد دیگرے طویل آیات سے توضیح کرتے ہیں۔ کبھی کسی آیت میں دو فاصل لاتے ہیں۔
یہ بعض اوقات اشعار میں بھی ہوتا ہے جیسے اس شعر میں:

کَالزَّهْرِ فِيْ تَرَفٍ وَالْبَدْرِ فِيْ شَرَفٍ   وَالْبَحْرِ فِيْ كَرَمٍ ' وَالدَّهْرِ فِيْ هِمَمٍ[1]

تازگی میں پھول کی طرح اور شرف میں چودھویں کا چاند   اور سخاوت میں سمندر اور ہمت میں گویا سارا زمانہ

کبھی ایک آیت سلسلے کی دوسری آیتوں سے زیادہ لمبی ہوتی ہے۔ اس میں یہ نکتہ ہے کہ جب اس حسنِ کلام کا (جو وزن اور قافیہ سے پیدا ہوتا ہے) اس حسن کلام سے موازنہ کریں جو بیان کی بے ساختگی' سادگی اور طبعی ترکیب سے حاصل ہوتا ہے تو فطرتِ سلیم حسنِ معنوی کو ترجیح دے گی۔ ایسے موقعوں پر یہ سمجھنا چاہیے کہ ایک قسم کے حسن کے انتظار کو ترک کر کے دوسری قسم کے انتظار کا حق پورا کیا جا رہا ہے۔

ہم نے آغازِ بحث میں یہ کہا تھا کہ "اکثر سورتوں میں اللہ تعالیٰ کا طریقہ بیان یہ ہے کہ اس کا کلام آیات پر مشتمل ہوتا ہے" ایسا اس لیے کہا تھا کہ بعض سورتوں میں اس قسم کے وزن اور قافیے کی رعایت نہیں دکھائی دیتی۔ پس کلام اللہ کا ایک حصہ خطباء کے خطبوں اور نکتہ رس حکماء کے رسالوں کی طرح واقع ہوا ہے۔ کیا تم نے عورتوں کا قصہ جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے' نہیں سنا ہے؟ اس قصے کے قافیوں پر غور کرو۔

قرآن کریم کی بعض سورتیں اہلِ عرب کے مُراسلات کی طرح ہیں۔ ان میں کسی امر کی رعایت نہیں رکھی گئی ہے۔ یہ اُسی طرح ہیں جس طرح بعض لوگ آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن بات ایسی چیز پر ختم کی جاتی ہے' جو ختم کرنے ہی کے قابل ہوتی ہے۔ یہاں نکتہ یہ ہے کہ عربی زبان میں وقفہ یا ٹھہراؤ ایسے موقع پر ہوتا ہے جہاں سانس ختم ہو جائے۔ اور کلام میں نشاط باقی نہ رہے۔ اور وقفہ کے لیے بہتر یہ ہے کہ کلام حرفِ مدّہ پر ختم ہو۔ یہی وہ وجہ ہے جس سے آیات کی موجودہ صورت بنی ہے۔ یہ وہ رموز ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس فقیر کے دل میں ڈالے ہیں۔ واللہ اعلم

---

[1] یہ قصیدۂ بُردہ کا شعر ہے' حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شانِ اقدس میں۔

تیسری فصل

قرآنِ عظیم سے متعلق مختلف سوالات اور ان کے جوابات

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ علومِ خمسہ کے مضامین کی تکرار بار بار قرآنِ عظیم میں کیوں کی گئی ہے؟ ایک ہی موقع پر ایک بات کو بیان کرنا کیوں کافی نہیں سمجھا گیا؟ اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ جو چیز مخاطب کو فائدہ دے سکتی ہے وہ دو قسم پر منقسم ہے۔ ایک تو یہ کہ مقصود صرف اس چیز کی تعلیم دینا ہو جسے مخاطب نہیں جانتا۔ اس صورت میں مخاطب کو پہلے سے علم نہ ہو گا اور اس کا ذہن اس کے ادراک سے خالی ہو گا۔ جب وہ کلام سنے گا، تب اسے ایک نامعلوم چیز معلوم ہو جائے گی۔

دوسری قسم یہ ہے کہ اس علم کی تصویر مخاطب کے دل پر اس طرح نقش کر دینا مقصود ہو کہ ہر وقت اُس کے پیشِ نظر رہے، اُس سے لطف اندوز ہوتا رہے، اس کے قلب و ادراک کی قوتیں اس علم میں مستغرق ہو جائیں، حتیٰ کہ اس علم کا رنگ تمام قوتوں پر غالب آ جائے۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے ہم کسی شعر کو، جس کے معنی ہمیں معلوم ہیں، بار بار پڑھتے ہیں، اور ہر بار لطف حاصل کرتے ہیں اور اس لطف و مزے کی خاطر مکرّر سہ کرّر پڑھتے جاتے ہیں۔

قرآنِ عظیم میں علومِ خمسہ کی تعلیم کے لیے دونوں قسم کے طریقے برتے گئے ہیں۔ بے علم کے لیے "نامعلوم کی تعلیم" کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اور جاننے والے (یا عالم) کو علوم یا "معلومات کی تکرار" کے ذریعے پورا پورا رنگ دینا مقصود ہے۔

اکثر احکام کے مضامین بار بار نہیں دہرائے گئے۔ کیونکہ ان سے دوسری قسم کا فائدہ مطلوب نہ تھا۔ اسی لیے شریعت میں بار بار تلاوت کا حکم دیا گیا ہے اور صرف سمجھ لینے ہی کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ اکثر حالات میں ان مسائل کی تکرار جدید عبارت اور انوکھے طرز میں کی گئی ہے' تاکہ نفس پر زیادہ موثر ہو اور ذہن لفظی تکرار نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ لذت حاصل کرے۔ عبارت اور اسلوبِ بیان کے مختلف ہونے کی وجہ سے ذہن کو غور و خوض کرنے کا موقع ملتا ہے' اور اس طرح مضمون دل کی گہرائی میں اتر جاتا ہے۔

اگر کوئی یہ پوچھے کہ ان علومِ خمسہ کو قرآن مجید میں منتشر کیوں کر دیا گیا؟ ترتیب کی رعایت کیوں نہیں کی؟ مثلاً پہلے آلآءُ اللّٰہ (اللہ کی نعمتوں) کا ذکر پورا کیا جاتا۔ اس کے بعد ایام اللہ کا پورا بیان کیا جاتا۔ پھر ''کفار سے مباحثہ'' کی تفصیل کی جاتی۔

اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی قدرت تمام ممکنات پر حاوی ہے۔ اس قسم کے امور کی بنا حکمت و مصلحت پر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن عربوں کی زبان اور ان کے اسلوبِ بیان میں اتارا گیا ہے۔ چنانچہ ذیل کی آیات میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَقَالُوْا لَوْ لَا فُصِّلَتْ اٰيَاتُهٗ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ...... (۴۱:۴۴)

''اگر ہم اسے عجمی قرآن بناتے تو ضرور وہ کہتے اس کی آیتیں کھول کر کیوں بیان نہیں کی گئیں؟ کیا عجمی اور عربی'' (برابر ہیں؟)

نزولِ قرآن سے پہلے عربوں کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی۔ نہ آسمانی کتاب تھی اور نہ کسی انسان کی تصنیف و تالیف۔ مضامین کی ترتیب سے جو مصنفین کی اختراع ہے' عرب نا آشنا تھے۔ اگر تم کو اس میں شک ہو تو مُخَضْرَمِیْن[1] شعراء کے قصائد پڑھ لو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مراسلات اور حضرت عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) کے مکتوبات کا مطالعہ کر لو۔ تم پر یہ بات واضح ہو جائے گی۔

---

[1] مُخَضْرَمِیْن: ان شعراء کو کہا جاتا ہے' جنھوں نے جاہلیتِ عرب کا زمانہ بھی دیکھا ہو اور اسلام کا زمانہ بھی پایا ہو۔

اگر قرآنِ مجید کی زبان اور اس کا اسلوبِ بیان عربوں کے موافق نہ ہوتا تو اسے سن کر وہ متحیر رہ جاتے۔ اور ایسا کلام جس سے ان کے کان نا آشنا تھے سنتے تو ان کا ذہن پریشان ہو جاتا۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ تعلیم سے صرف یہ مقصود نہیں ہے کہ نامعلوم کا علم ہو جائے۔ بلکہ یہ مقصد بھی ہے کہ وہ پیشِ نظر رہے اور تکرار سے اس میں پختگی ہو۔ یہ مقصد غیر مرتب صورت میں (یا منتشر آیات کے ذریعے) ہی پورا ہو سکتا ہے۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ وزن و قافیہ جس طرح شعراء کے یہاں استعمال کیے جاتے ہیں کیوں نہیں اختیار کئے گئے؟ کہ یہ زیادہ پُر لطف ہوتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح قوموں کے مذاق و اذہان مختلف ہیں، اسی طرح ان کے ذوق میں بھی اختلاف ہے۔ اور اگر یہ تسلیم کر لیں کہ شعراء کے وزن و قافیے کا طریقہ زیادہ پر لطف ہے، تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اُمی ہونے کے باوجود وزن و قافیے کا نیا انداز ایجاد کرنا آپ کی نبوت کی ایک کھلی دلیل ہے۔ کیونکہ اگر شعراء کے وزن و قافیہ میں قرآن نازل کیا جاتا تو کفار ضرور خیال کرتے کہ یہ بھی ویسے ہی اشعار ہیں جیسے عرب میں ہر طرف مشہور و معروف ہیں۔ اور کوئی انھیں خاطر میں نہ لاتا۔ فصیح و بلیغ نظم و نثر کہنے والے شاعر و ادیب اپنے معاصرین میں نمایاں و ممتاز ہونا چاہتے ہیں تو کوئی جدید اندازِ بیان یا نیا اسلوب اختراع کرتے ہیں، اور اعلان کرتے ہیں کہ کوئی ہے جو اس انداز کی غزل کہہ سکے؟ یا اس طرح کا مضمون لکھ سکے؟ اگر ان کا اندازِ بیان قدیم طرز کا ہو تو اس سے ان کے کمالِ انشاء کا ادراک محققین کے سوا عوام نہیں کر سکتے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ قرآن کو معجزہ کس اعتبار سے کہا جاتا ہے، تو ہم کہیں گے کہ اس کے اعجاز کے بہت سے وجوہ ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ اسلوبِ بدیع (نیا اندازِ بیان)۔ عربوں کے پاس بلاغت کے چند مقررہ میدان تھے۔ انہی میں وہ اپنی بلاغت کی گھوڑے دوڑاتے تھے۔ اور اپنے معاصرین سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ قصائد، خطبات، رسائل اور محاورات کے چار میدان تھے۔ ان چار کے علاوہ وہ کسی اور اسلوب سے واقف نہیں تھے۔ ان کے علاوہ کسی نئے اسلوب کا اختراع وہ نہیں کر سکتے تھے۔ ایسی صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

زبانِ مبارک سے' آپ کے امی ہونے کے باوجود ایک نئے اسلوب کی ایجاد ایک معجزہ نہیں تو اور کیا ہے؟

۲۔ قرآنِ مجید میں اُممِ سابقہ کے تاریخی واقعات' ان کے قصے اور احکام بیان کئے گئے ہیں۔اس طرح کہ وہ اگلی کتابوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ (حالانکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پڑھے لکھے نہیں تھے)

۳۔ قرآن مجید میں آنے والے احوال و واقعات کی خبر دی گئی ہے۔تو جب بھی کوئی بات اس کے مطابق ظاہر ہوگی۔ایک نیا معجزہ ظاہر ہوگا۔

۴۔ قرآن مجید میں اعلیٰ درجہ کی بلاغت ہے' جو کسی انسان سے ممکن نہیں۔

ہم لوگ عربِ اوّل کے بعد میں پیدا ہوئے اس لیے بلاغت کی حقیقت تک ہماری رسائی نہیں۔لیکن جس قدر ہم نے جانا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں موزوں کلمات' خوب صورت ترکیبیں' چست بندشیں جس لطافت' سادگی اور بے تکلفی سے استعمال کی گئی ہیں' متقدمین اور متاخرین کے قصائد میں نظر نہیں آتیں۔یہ ایک وجدانی و ذوقی چیز ہے جسے ماہر شعراء ہی جان سکتے ہیں۔عوام کچھ نہیں سمجھ سکتے۔

۵۔ قرآن مجید کے عجائب ونوادر میں ایک یہ بھی ہے کہ تذکیر یا مباحثہ کے موقع پر معانی کو جو بھی لباس پہنایا جاتا ہے وہ سورت کے خاص اسلوب کے مناسب ہوتا ہے۔اس کے دامن تک ادراک کا ہاتھ پہنچنے سے قاصر رہتا ہے۔

اگر کوئی شخص یہ بات نہ سمجھے' تو اسے چاہیے کہ انبیا کے ان قصوں میں غور کرے جو سورۂ اعراف' ھود اور شعراء میں مذکور ہیں۔پھر یہی قصے سورہ صافات اور ذاریات میں پڑھے۔ فرق ظاہر ہو جائے گا۔اسی طرح گنہگاروں کو عذاب دینے اور فرمان بردار بندوں کو نعمتوں سے نوازنے کا بیان ہر مقام پر ایک نئے انداز سے کیا گیا ہے۔اہلِ دوزخ کے جھگڑنے کا ذکر ہر موقع پر ایک خاص شکل میں ہے جس کی تفصیل طویل ہے۔

۶۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں حسبِ مقتضائے حال استعارات و کنایات کا استعمال کیا گیا ہے۔یہ ایسی چیزیں ہیں جن کی تفصیل علمِ معانی و بیان میں ملتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی حالت کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے جو محض ان پڑھ اور ادبی

صنائع سے قطعاً نا آشنا تھے۔ یہ حُسنِ ادا جس انداز سے قرآن میں نظر آتا ہے' اس سے بہتر کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ مشہور و معروف مطالب میں ایسے نکتے سمو دیے جائیں جو عوام کی نگاہوں میں نکھر کر نمایاں ہو جائیں اور خواص کے لیے پسندیدہ ہوں۔ اس طرح گویا دو متضاد چیزوں کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ (سبحان اللہ)

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار　　گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

۷۔ قرآن کے معجزہ ہونے کی وجوہ میں ایک وجہ ایسی ہے جسے صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اسرارِ شریعت میں فکر و تدبّر کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ علومِ خمسہ خود دلالت کرتے ہیں اس امر پر کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی آدم کی ہدایت کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی طبیب جب قانون کا مطالعہ کرتا ہے۔ (جو بو علی سینا کی مشہور کتاب ہے) اور اس میں امراض کے اسباب و علامات اور دواؤں کے خواص کی تحقیق و تدقیق کے مباحث پڑھتا ہے' تو وہ یقین کر لیتا ہے کہ اس کتاب کا مؤلف فنِ طب میں کامل ہے' اسی طرح شریعتوں کے اسرار کا عالم جو یہ جانتا ہو کہ افرادِ انسانی کی تہذیبِ نفس کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے' وہ ''علومِ خمسہ'' میں غور و فکر کرے تو اس پر یہ ثابت ہو جائے گا کہ یہ علوم ایسے اعلیٰ درجے پر ہیں جن سے برتر کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ع: آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔

❁ ❁ ❁

باب چہارم

فنِ تفسیر، تفسیر میں صحابہؓ و تابعین کا اختلاف اور حلِ اختلاف

مفسرین کی مختلف جماعتیں ہیں۔ایک جماعت ان آثار کی روایت پر چلتی ہے، جو آیات سے مناسبت رکھتے ہیں۔خواہ وہ مرفوع حدیث ہو یا موقوف۔کسی تابع کا قول ہو یا اسرائیلی روایت۔یہ محدثین کا مسلک ہے۔

ایک فرقہ اسماء و صفات کی آیات میں تاویل کرتا ہے۔جو آیت مذہبِ تنزیہ کی موافقت میں نہیں ہوتی، اس کے ظاہری معنی نہیں لیتے اور مخالفین کے اعتراض کو رد کرتے ہیں جو متعلقہ آیات پر کئے جاتے ہیں، یہ متکلمین کا طریقہ ہے۔

ایک جماعت فقہ کے مسائل کا استنباط کرتی ہے اور بعض اجتہادات کو بعض پر ترجیح دیتی ہے اور اپنے مخالف کی قرار داد پر جواب وارد کرتی ہے، یہ فقہا اور اہلِ اصول کی جماعت کا طریقہ ہے۔

ایک جماعت قرآنی لغت اور نحوی ترکیب کی وضاحت کرتی ہے اور بات بات میں کلامِ عرب سے بکثرت اسناد و شواہد پیش کرتی ہے یہ علماءِ نحو اور علماءِ لغت کا منصب ہے۔

ایک گروہ قرآن مجید میں علمِ معانی و بیان کی رو سے غور کر کے نکات دریافت کرتا اور کلام کی داد دیتا ہے، یہ ادیبوں کا گروہ ہے۔

بعض لوگ قرآن کی ان قرأتوں کے بارے میں روایت کرتے ہیں جو اسلاف اساتذہ

سے منقول ہیں' اور قرأت سے متعلق باریک باتوں پر بحث کرتے ہیں، یہ قاریوں کی صفت ہے۔

ایک جماعت آیات میں ادنیٰ مناسبت پا کر علمِ سلوک یا علمِ حقائق سے متعلق نکات پر گفتگو کرتی ہے۔ یہ صوفیوں کا مسلک ہے۔

الحاصل تفسیر کا میدان بہت وسیع ہے۔ ہر شخص اپنے طور پر قرآن کے مطلب کو سمجھنا چاہتا ہے۔ اور ہر شخص ایک خاص فن کی رو سے غور کرتا اور اپنی قوتِ فصاحت اور فہم کے مطابق گفتگو کرتا ہے اور اپنی جماعت کا نظریہ پیشِ نظر رکھتا ہے۔ یہی وہ سبب ہے جس کی بنا پر فنِ تفسیر میں لامحدود وسعت ہو گئی۔ اور اس پر کثرت سے کتابیں لکھی گئیں جن کا شمار ممکن نہیں۔ ایک جماعت نے ان سب کو ایک جگہ جمع کرنے کا ارادہ کیا۔ تو کبھی عربی میں کتاب لکھی اور کبھی فارسی میں۔ یہ کتابیں اختصار اور اطناب کے لحاظ سے متفرق ہیں۔ اس طرح علم کا دامن اور وسیع ہو گیا، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس کی توفیق سے فقیر کو ان تمام علوم میں مناسبت حاصل ہے۔

میں نے علمِ تفسیر کے اکثر اصول و فروع کو سمجھ لیا ہے۔ مجھے اس کے ہر مسئلے میں ایسی تحقیق و پختگی حاصل ہے جسے "مذہبی اجتہاد" کے مشابہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ فنِ تفسیر کے دو تین اور علوم بھی دریائے فیضِ الٰہی سے میرے دل میں القا ہوئے ہیں۔ اگر تم سچی بات پوچھو تو میں قرآن عظیم کا براہِ راست اسی طرح شاگرد ہوں جس طرح حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلّم کی روح پُر فتوح کا اویسی[1] ہوں' جو فتوحات کا سرچشمہ ہیں۔ گویا جس طرح "کعبۂ حسنیٰ" سے براہِ راست مستفید ہوں' اسی طرح "صلوٰۃِ عظمیٰ" سے بلا واسطہ اثر لیتا ہوں۔[2]

لَوْاَنَّ لِیْ فِیْ کُلِّ مَنْبَتِ شَعْرَۃٍ   لِسَانًا لَمَا اسْتَوْفَیْتُ وَاجِبَ حَمْدَۃٍ

گر برتنِ من زباں شود ہر موئے   یک شکرِ تو از صد ہزار نتوانم کرد

اس کتاب میں ان علوم میں سے دو باتیں لکھنے کی ضرورت سمجھتا ہوں۔

---

[1] حضرت اویس قرنی کا قصہ مشہور ہے۔ یمنی تھے۔ خیر القرون کا زمانہ پایا تھا۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلّم سے انھیں غائبانہ سچی عقیدت و محبت تھی۔ خدمتِ اقدس میں جسمانی اعتبار سے حاضری کی سعادت سے محروم رہے' مگر روحانی اعتبار سے براہِ راست حضور ﷺ سے باطنی فیوض حاصل تھے۔ (مترجم)

[2] کعبۂ حسنیٰ سے مراد مرکزِ فیوض و برکات (یعنی قرآن عظیم) ہے اور صلوٰۃِ عظمیٰ سے مراد رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ مترجم

پہلی فصل

اہلِ حدیث کی تفسیری کُتب میں روایت کردہ آثار اور اُن کے متعلقات

کتبِ تفسیر میں جو آثار روایت کیے گئے ہیں۔ ان میں کچھ آثار سببِ نزول سے متعلق ہیں۔ اور سببِ نزول کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: کوئی ایسا واقعہ ہوا جس میں مومنوں کا ایمان اور منافقوں کا نفاق ظاہر ہو گیا۔ جیسا کہ غزوۂ احد و احزاب میں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی مدح اور منافقوں کی مذمت فرمائی۔ تا کہ دونوں فریق میں امتیاز ہو جائے۔ اس مدح و ذم کے سلسلے میں حادثے کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ بکثرت تعریضات ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ پہلے حادثے کی وضاحت اختصار کے ساتھ کر دی جائے تا کہ ان آیات کے پڑھنے والے پر سیاقِ کلام واضح ہو جائے۔

دوسری قسم: یہ ہے کہ آیت کے معنی حادثے کے معلوم کئے بغیر ہی کئے جائیں۔ سببِ نزول کی تلاش نہ کی جائے۔ اور آیت کے معنی میں عمومیت مدِّنظر رہے۔ عمومیت لفظ سے متعلق ہو نہ مخصوص سببِ نزول سے۔

متقدمین مفسرین کا مقصد کسی واقعہ کو سببِ نزول بتانے سے یہ تھا کہ آیت کے مناسب آثار و احادیث جمع ہو جائیں۔ یا یہ تھا کہ آیت حکمِ عام کے لیے ''مصداق'' ہو سکے۔ حالانکہ اس قسم کی باتیں غیر ضروری تھیں۔

اس فقیر کے نزدیک یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ صحابہؓ اور تابعین جو اکثر کہا کرتے تھے کہ "یہ آیت ایسے اور ایسے موقع پر نازل ہوئی۔" اس سے ان کی غرض صرف آیت کے مصداق کا تصوّر دلانا ہوتا تھا (تاکہ لوگ یہ سمجھ جائیں کہ کیسے موقع پر اسے پیش نظر رکھا جائے) نیز اس سے مقصود بعض مخصوص واقعات کا ذکر بھی ہوتا تھا جو آیت میں بطور عمومیت شامل ہوں۔ چاہے وہ واقعہ (جسے انھوں نے سببِ نزول بتایا ہے) آیت کے نزول سے پہلے ہوا ہو یا بعد میں وہ اسرائیلی قصہ ہو یا جاہلی یا اسلامی' آیت کے تمام قیود کو حاوی ہو یا اس کے بعض حصے کو۔ واللہ اعلم.

اس تحقیق سے یہ معلوم ہوگیا کہ اجتہاد کو بھی سببِ نزول میں دخل ہے۔ اور اس میں متعدد قصوں کے ذکر کرنے کی گنجائش ہے۔ جو شخص اس نکتے کو پیش نظر رکھے گا، وہ تھوڑی سی توجہ سے سببِ نزول میں اختلاف کا حل نکال لے گا۔

اس سلسلے میں یہ بھی ہے کہ قرآنی آیات کی ترتیب میں جس قصے کی طرف اشارہ موجود ہو اس کی تفصیل کردی جائے۔ مفسّرین ایسے موقعوں پر بنی اسرائیل کے بتائے ہوئے واقعات یا تاریخ وسوانحات سے قصہ اخذ کرتے ہیں' اور اس کے تمام پہلوؤں کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ یہاں ایک اور وضاحت کی ضرورت ہے' اور وہ یہ ہے کہ اگر کسی آیت میں بظاہر کسی لفظ سے اشارہ پایا جاتا ہو، جس پر اہلِ زبان رک جائے اور اس کی تلاش کرنے لگے، تو مفسّر کا فرض ہے کہ اس کی توضیح کردے۔ اور جس آیت میں ایسی کوئی بات نہ ہو' وہاں کاوش کرنا لایعنی تکلف ہے۔ مثلاً: بنی اسرائیل کے قصہ بَقَـرَة کے متعلق کہ وہ نر تھا' یا مادہ تھی۔ یا اصحابِ کہف کے کتے کے بارے میں کہ چتکبرا تھا یا سرخ۔ صحابہ (رضی اللہ عنہم) ایسی باتوں کو برا سمجھتے اور تضیعِ اوقات میں شمار کرتے تھے۔

یہاں اور دو باتیں یاد رکھنے کے لائق ہیں۔ ایک یہ کہ سنے ہوئے قصے کو بغیر کسی عقلی تصرف کے بیان کردیا جائے۔ قدیم مفسّرین کی ایک جماعت نے ایسا نہیں کیا ہے' وہ کسی آیت میں تعریض ہی کے پیچھے پڑ گئے۔ انہوں نے کوئی مناسب موقع فرض کرلیا' اور بصورتِ احتمال اس پر تقریر کی جس کے سبب سے ان کے بعد آنے والے مفسرین کو اشتباہ ہوگیا۔ ایسا ہونا اکثر ممکن ہے' کیونکہ جو تقریر بصورتِ احتمال ہوتی ہے' آگے جاکر وہ پکی تقریر کے مشابہ ہوجاتی

ہے۔ اس لیے کہ اگلے زمانے میں تقریر کے اسالیب آج کل کی طرح خالص و پاکیزہ نہیں تھے۔

یہ مسئلہ اجتہادی ہے۔ اس میں عقل لگانے کی گنجائش ہے۔ اُس میں عقل کا دائرہ اور بحث کا میدان بہت وسیع ہے۔ جو شخص اس نکتے کو یاد رکھے گا۔ وہ اکثر مقامات پر مفسّرین کے اختلاف کا فیصلہ کر سکے گا۔ نیز صحابہؓ کے بہت سے مناظرات کے متعلق اس پر حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ ان کا قول نہیں ہے (یعنی ان کا مسلک نہیں ہے) وہ صرف ایک علمی تفتیش ہے، جو بعض نے بعض کے سامنے پیش کر دی ہے۔ یہ فقیر اسی اصول کے تحت حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کو سمجھتا ہے، جو انھوں نے فَامْسَحُوْا بِرُؤُسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ (پس تم مسح کرو اپنے سروں کا اور پاؤں کو ٹخنوں تک) کے بارے میں فرمایا تھا کہ:

لَآ اَجِدُ فِي كِتَابِ اللّٰهِ اِلَّا الْمَسْحَ لٰكِنَّهُمْ اَبَوْا اِلَّا الْغُسْلَ

"میں تو قرآن میں پاؤں کا مسح ہی پاتا ہوں، لیکن لوگ اس سے دھونا ہی سمجھتے ہیں۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس قول کا مطلب فقیر نے یہ سمجھا ہے کہ وہ مسح کے واجب ہونے کی طرف نہیں گئے ہیں۔ اور نہ ان کے قول میں کوئی ایسی یقینی بات ہے، جسے مسح کی رکنیت پر محمول کیا جا سکے۔ ان کے نزدیک وضو میں پیر دھونے کا فیصلہ ہی درست ہے۔ لیکن وہ یہاں ایک مشکل کا بیان اور ایک احتمال کا اظہار کر رہے ہیں۔ جس سے مقصد یہ ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ علماءِ زمانہ اس تعارض میں مطابقت کیونکر پیدا کرتے ہیں اور کون سی روش اختیار کرتے ہیں۔ جو لوگ اسلاف کے محاورے (یا اندازِ بیان) سے واقف نہیں ہیں، وہ حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کو ان کا مذہب سمجھنے لگے۔ حاشا وکلا۔[1]

دوسری نکتے کی بات یہ ہے کہ اسرائیلی روایات کی بلا ہمارے دین میں داخل ہو گئی ہے۔ حالانکہ یہ قاعدہ بنا دیا گیا کہ ان کی کتاب کی نہ تو تصدیق کرو اور نہ تکذیب۔ اس قاعدے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ قرآن کی تعریض کا بیان جب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں مل جائے تو اہل کتاب سے نقل کرنے کے ہم مرتکب نہ ہوں مثلاً ذیل کی آیت:

[1] اس کتاب کے صفحہ ۶۹ میں بھی آیت مذکورہ سے متعلق کچھ وضاحت ہے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمٰنَ وَاَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّہٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ (۳۸: ۳۴)

"اور البتہ ہم نے امتحان میں ڈالا سلیمان کو اور اس کے تخت پر ایک جسد کو ڈال دیا پھر اس نے رجوع کر لیا"[۱]

اس آیت سے متعلق جب حدیثِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ "انشاء اللہ" کے ترک کرنے کی وجہ سے حضرت سلیمانؑ پر گرفت کی گئی، تو اس کے بعد بنی اسرائیل سے صخرہ کا قصہ کیوں لیا جائے؟

۲۔ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ "ضروری چیز بقدرِ ضرورت ہی محدود رہنی چاہیے" اس بنا پر تفسیر کرنے میں بھی یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ تعریض کے اقتضا کے مطابق ہی بیان محدود رہے تا کہ اس کی تصدیق قرآنی شہادت سے ہو سکے۔ اس سے زیادہ بیان سے زبان کو روکنا چاہیے۔

یہاں ایک نہایت لطیف نکتہ ہے جسے ہرگز فراموش نہ کرنا چاہیے، اور وہ یہ ہے کہ قرآن میں کبھی کسی جگہ ایک قصے کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور دوسری جگہ اس کی تفصیل ہوتی ہے۔ جیسے ایک جگہ پہلے فرمایا:

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ (۲: ۳۰) "بے شک میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے"۔

اس کے بعد یہ فرمایا:

اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ (۲: ۳۳)

"کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی چھپی باتوں کو جانتا ہوں، اور وہ بھی جانتا ہوں کہ جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو؟"

یہ بیان اصل میں وہی بیانِ سابق ایک طرح کی تفصیل کے ساتھ ہے۔ اس لیے اس تفصیل سے اجمالِ سابق کی تفصیل کر سکتے ہیں۔ اور اس اجمال سے تفصیل کی طرف منتقل ہو

---

[۱] حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الرحمٰن میں اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ: حضرت سلیمانؑ اپنے امرا سے ناراض ہوئے تو دل میں کہا کہ "سو بیویوں کے پاس جاؤں گا، میرے سو بچے ہوں گے، ہر بچہ بڑا ہو کر شہسوار مجاہد بنے گا، مجھے درباری امرا کی خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی"۔ فرشتے نے کہا: انشاء اللہ کہو۔ حضرت سلیمانؑ یہ کہنا بھول گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ایک بچہ پیدا ہوا۔ وہ بھی ناقص الخلقت تھا۔ اسے تخت پر ڈال دیا گیا۔ تب حضرت متنبہ ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوئے۔

سکتے ہیں۔ مثلاً سورۂ مریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ اجمالاً اس طرح بیان فرمایا:

وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا (۱۹ : ۲۰)

"اور تا کہ ہم اسے بنائیں ایک نشانی لوگوں کے لیے اور اپنی طرف سے ایک رحمت۔ یہ بات طے شدہ ہے۔"

اور سورۂ آل عمران میں اس کی تفصیل اس طرح شروع ہوتی ہے:

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ......

"اور میں رسول ہوں بنی اسرائیل کی طرف کہ البتہ میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے آیت لایا ہوں"

اس طرح اس میں تفصیلی بشارت ہے، اوپر کی آیت میں بشارت اجمالی۔ اس لیے اس بندۂ ضعیف نے آیت کے معنی اس طرح کیے ہیں:

رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُخْبِرًا بِاَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ......

"میں رسول ہوں بنی اسرائیل کی طرف خبر دیتا ہوں اس بات کی کہ میں آیا ہوں تمہارے پاس۔"

یہ پورا مضمون بشارت میں داخل ہے۔ کسی محذوف کے متعلق نہیں ہے جیسا کہ علامہ سیوطی نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہا ہے۔

فَلَمَّا بَعَثَهُ اللّٰهُ قَالَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ بِاَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ......

"پھر جب اللہ نے اسے بھیجا، تو اس نے کہا کہ میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف، اس طرح کہ البتہ میں آیا ہوں تمہارے پاس۔ ۔ ۔ ۔"

- اس سلسلے میں نادر شرح بھی ہے، جس کی بنا عربی لغت کے تتبع پر ہے۔ یا آیت کے سیاق و سباق کے فہم پر، اور مناسبت لفظی کے علم پر (جو جملے کے اجزاء کے ساتھ ہوتی ہے) یہاں بھی عقل کو دخل اور اختلاف کے لیے گنجائش ہے۔ کیونکہ عربی زبان میں ایک کلمہ مختلف معنوں کے لیے آتا ہے۔ عربوں کے استعمال کی پیروی میں اور مضمون سابق و لاحق کی مناسبت کو سمجھنے میں سب کی عقلیں یکساں نہیں ہوتیں (کوئی کچھ سمجھ لیتا ہے، کوئی کچھ اور) اسی وجہ سے صحابہؓ اور تابعین کے اقوال میں اختلاف ہو گیا۔ پس ایک منصف مفسر کو چاہیے کہ وہ کسی نادر شرح کے

دو پہلوؤں پر غور کرے:

(۱) استعمالِ عرب پر، کہ اس اعتبار سے کون سی صورت زیادہ قوی ہے۔

(۲) مضمونِ سابق و لاحق کی مناسبت پر، کہ کون سی جہت قابلِ ترجیح ہے۔ ۱

اس فقیر نے تفسیر کے ابتدائی اصول کے انضباط کے بعد، اور مواقعِ استعمال کے تتبّع سے اور احادیث کی تلاش کر کے نادر شرح سے متعلق ایسے نتائج کا استخراج کیا ہے، جن کا لطف گمراہ اور سخت دل کے سوا کسی اور پر مخفی نہیں رہ سکتا۔ مثلاً ایک یہ آیت ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى......... ۱

"فرض کر دیا گیا تم پر قصاص مقتولوں کے بارے میں"۔

---

۱ آیت شریفہ کا پورا حصہ یہ ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى

"فرض کر دیا گیا تم پر قصاص مقتولوں کے بارے میں۔ آزاد، آزاد کے بدلے، غلام غلام کے بدلے، اور عورت عورت کے بدلے"۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ "قصاص" کے معنی ہیں "قتل" اور قَتْلٰی کے معنی میں قاتل اور مقتول دونوں شامل ہیں۔ اگر اسے صحیح مان لیں تو اَلْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى کی توجیہ میں مشکل پیش آتی ہے۔ اس صورت میں یا تو نسخ کے متعلق غور کرنا ہوگا یا پھر معقول کی توجیہ تلاش کرنی پڑے گی۔

شاہ صاحب نے بہت صاف اور سادہ روش اختیار کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ: اس میں "تَکَافُؤ" کا حکم ہے۔ تکافُؤ کے معنی ہیں "باہم برابر برابر ہونا"۔ حدیث ہے: اَلْمُسْلِمُوْنَ تَتَكَافَأُ دِمَاءُهُمْ (یعنی سب مسلمانوں کے خون برابر ہیں)۔ (خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست)

جاہلیتِ عرب میں رواج تھا کہ کسی قبیلے کا ایک آدمی قتل ہو جاتا، تو اس کے بدلے سینکڑوں کا خون بہا دیتے۔ ایک ادنیٰ درجے کا آدمی کسی معزز آدمی کو قتل کر دیتا تو اسی کے قتل کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کے معزز آدمی کو قتل کرنے کے درپے ہوتے۔ اس کے برخلاف اگر کسی معزز گھرانے کا ایک فرد کسی ادنیٰ درجے کے آدمی کو قتل کر دیتا، تو کسی کو پروانہ ہوتی، اور یہ ہرگز گوارا نہ ہوتا کہ وہ معزز گھرانے کا قاتل بھی قتل کر دیا جائے۔

قرآن نے اس بے انصافی کا قلع قمع کر دیا۔ اور قصاص کا یہ قانون بنا کر فرق و امتیاز کو ختم کر دیا" کہ قاتل آزاد ہو تو وہی قتل کیا جائے گا۔ اگر غلام ہو تو وہی قتل کیا جائے۔ عورت قاتل ہو تو وہی عورت قتل کی جائے"۔

آیت شریفہ سے صاف و صریح طور پر یہی مفہوم ذہن میں آتا ہے۔ اس میں کاوش کی ضرورت نہیں۔ قَتْلٰی، قَتِیْل (مذکر) اور قَتِیْلَۃ (مونث) دونوں کی جمع ہے۔ اس لیے مقتول چاہے مرد ہو یا عورت دونوں کے لیے یہ حکم ہے۔ پھر اَلْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى کی صراحت بھی آ گئی ہے۔

اس سے مطلب قاتل ومقتول کا برابر ہونا ہے (تَکَافُوْ) اور حکم واحد میں دونوں مشترک ہیں۔ تا کہ اَلْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی (عورت عورت کے بدلے) کے معنی سمجھنے میں نسخ کی طرف مائل ہونے کی ضرورت نہ رہے۔ اور کوئی ایسی توجیہ نہ کرنی پڑے، جو ادنیٰ توجہ سے ہی کمزور نظر آئے۔

دوسری مثال:

يَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَهِلَّةِ وہ تجھ سے پوچھتے ہیں ہلالوں کے بارے میں۔

اس کے معنی: يَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَشْهُرِ (یعنی وہ تجھ سے پوچھتے ہیں مہینوں کے بارے میں) کیے جائیں۔ یعنی سوال حج کے مہینوں سے متعلق کیا گیا تھا۔ اس کا جواب هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ (وہ لوگوں کے لیے مقررہ اوقات ہیں اور حج کے لیے) دیا گیا۔[1]

تیسری مثال:

هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ (۵۹ : ۱)

وہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو جو کافر ہیں ان کے اپنے گھروں سے نکالا "پہلے حشر" کے لیے۔

یہاں "لِاَوَّلِ الْحَشْرِ" کے معنی لِاَوَّلِ جَمْعِ الْجُنُوْدِ (لشکروں کی پہلی جمع کے لیے) ہیں۔ کیونکہ حشر کے معنی جمع کرنے کے ہیں جیسا کہ اللہ تعالی نے ایک جگہ فرمایا: وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ (اور بھیج دے شہروں میں جمع کرنے والوں کو) اور دوسری جگہ ہے: حُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ (اور جمع کیے گئے ہیں سلیمان کے لئے اس کے لشکر)

یہ معنی قصۂ بنی نضیر معلوم ہونے سے چسپاں ہوتے ہیں۔ اور مسلمانوں پر اللہ کا احسان صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے۔[2]

---

[1] اسی کتاب کے صفحہ ۲۰۷ پر بھی اس آیت سے متعلق وضاحت ہے۔ (مترجم)

[2] بنو نضیر یہودی تھے۔ مدینے میں رہتے تھے۔ اسلام کے سخت دشمن تھے۔ عبداللہ بن اُبی (مشہور منافق) ان کا ہم راز اور در پردہ مددگار تھا۔ جنگِ احد کے بعد قریشِ مکہ نے انہیں کہلا بھیجا تھا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دو۔ یہ دشمن تو پہلے سے تھے ہی اس پیغام نے ان کا حوصلہ بڑھا دیا۔ آنحضرت صلی اللہ

(بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

ناسخ اور منسوخ سے متعلق دو نکتے یاد رکھنے کے قابل ہیں: ایک یہ کہ صحابہؓ اور تابعین نسخ کا استعمال اس اصطلاحی معنی میں نہیں کرتے تھے' جو اصولیوں نے بنایا ہے۔ وہ سادہ طور پر اسے ازالہ کے ہم معنی سمجھتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کے نزدیک ''نسخ'' کے معنی ہیں: ''پہلی آیت کے بعض اوصاف کا ازالہ بعد کی آیت سے۔'' اب اس کا تعلق مدتِ عمل کی انتہا سے ہو یا کلام کو متبادر معنی سے غیر متبادر معنی کی طرف پھیرنے سے' یا کسی قید کی زائد ہونے کا بیان ہو' یا عام کی تخصیص ہو' یا صاف وصریح حکم قرآنی سے جو کچھ قیاس کیا گیا ہو، اس میں فرق کا بیان ہو اور اسی قسم کی باتیں اس ضمن میں آتی ہیں، جس سے عقل دوڑانے کا میدان بہت وسیع ہو جاتا ہے اور اختلاف کی بہت گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ان صحاب نے منسوخ آیتوں کی تعداد پانچ سو تک پہنچا دی ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ نسخ کے اصطلاحی معنی کی رو سے یہ ضروری ہے کہ نزولِ آیات کا زمانہ معلوم ہو' لیکن کبھی سلفِ صالح کے اجماع یا جمہور کے اتفاق پر نسخ کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ بہت

(پچھلے صفحہ سے بقیہ حاشیہ)

علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ چند آدمیوں کے ساتھ تشریف لائیں۔ اپنا کلام سنائیں۔ اگر ہمارے احبار آپ کی تصدیق کریں گے تو ہم بھی مسلمان ہو جائیں گے۔

یہ ایک بڑی خطرناک سازش تھی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہلا بھیجا کہ جب تک تم ایک تحریری معاہدہ نہ دو، تم پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ بنونضیر اس پر راضی نہ ہوئے۔ اس کے بعد بھی ان کی کوشش فریب دے کر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نعوذ باللہ قتل کرنے کی رہی۔

بنونضیر بہت مضبوط قلعوں میں رہتے تھے۔ جن کا فتح کرنا مشکل تھا۔ عبداللہ بن ابی خفیہ طور پر ان کی اعانت کے وعدے کرتا رہتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کا محاصرہ کیا تو پندرہ دن تک کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچا۔ نہ ان کے ہم مذہب (بنو قریظہ) نہ قریش' نہ عبداللہ بن ابی کی جماعتِ منافقین۔

آخر کار بنونضیر عاجز آ گئے' اور اس بات پر راضی ہو گئے کہ جس قدر مال و اسباب اونٹوں پر لے جا سکیں لے جائیں اور مدینے سے باہر چلے جائیں۔ چنانچہ سب چلے گئے۔ کچھ خیبر گئے۔ اور کچھ ملک شام میں جا کر آباد ہو گئے۔ یہ ۴ھ کا واقعہ ہے۔

سورۂ حشر میں بنونضیر کے اسی قصے کا بیان ہے۔ ''حَشر'' کے معنی ''جلاوطنی'' کے بھی ہیں۔ اگر یہ معنی لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ بنونضیر کا ان کے گھروں سے نکلنا ''پہلی جلاوطنی'' کے لیے تھا (یعنی اس کے بعد بھی جلاوطنی ہوگی) (مترجم)

سے فقہا اس کے مرتکب ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ ممکن ہے کہ جس بات پر آیت صادق آتی ہے، وہ اجماع کے مطلب کی موافقت میں نہ ہو۔

حاصل یہ کہ نسخ کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنا عمر کو ضائع کرنا ہے۔ اس سے کلام کی گہرائیوں تک پہنچنا دشوار ہے۔ محدثین کے پاس ان اقسام کے علاوہ اور بہت سی چیزیں ہیں جنھیں وہ بیان کرتے ہیں۔ جیسے صحابہؓ کا کسی مسئلے میں مناظرہ، اس میں کسی خاص آیت کو بطور گواہ پیش کرنا یا کسی آیت سے مثال دینا، یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی آیت کو بطور سند تلاوت فرمانا، کسی آیت کے اصلی معنی کی موافقت میں کوئی حدیث بیان کرنا۔ تلفظ کے اس طریقے کی نقل کرنا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کا تھا۔

فصل دوم

احکام ومسائل کا استنباط

مذکورہ مباحث کے علاوہ ایک مبحث احکام و مسائل کا استنباط ہے۔ یہ مبحث بہت وسیع ہے۔ آیات کے مطالب' اشارات اور مقتضیات سے واقف ہونے کی خاطر عقل کے لیے اس میں وسیع میدان ہے۔ اور اختلاف کی پوری گنجائش ہے۔ اس فقیر کو استنباط کی دس قسمیں الہام کی گئی ہیں' اور ان کی ترتیب بتائی گئی ہے۔ یہ مقالہ بہت سے استنباط کیے ہوئے احکام کو وزن کرنے کے لیے صحیح میزان کا کام دے گا (یا کھوٹے کھرے کو پرکھنے کا معیار ہوگا):

ان اقسام میں سے ایک توجیہ ہے۔ اس فن کی بہت سے شاخیں ہیں۔ جنھیں شارحین اصل عبارت کی شرح کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ جس سے ان کی ذکاوت کا امتحان اور ان کے درجوں کا فرق معلوم ہو جاتا ہے۔ صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے قرآن کی توجیہ سے متعلق بہت گفتگو کی ہے' حالانکہ اس زمانے میں توجیہ کے اصول وقواعد نہیں بنے تھے۔

توجیہ کی حقیقت یہ ہے کہ اگر شارح کو مصنف کے کلام کو سمجھنے میں کسی دشواری پر رک جانا پڑے تو اس کو حل کر دے۔ چونکہ کتاب پڑھنے والوں کے ذہن ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے' اس لیے توجیہ بھی ایک سی نہیں ہوتی۔ مبتدیوں کی توجیہ کچھ اور ہوتی ہے' اور منتہیوں کی توجیہ کچھ اور۔ بسا اوقات منتہی کے دل میں کوئی ایسی مشکل بات پیدا ہو جاتی ہے جسے حل کرنے کی اسے ضرورت ہوتی ہے۔ مگر مبتدی اس سے غافل ہوتا ہے' وہ اس کی سمجھ سے باہر ہوتا ہے۔ کلام کا بہت سا حصہ مبتدی کے لیے مشکل ہوتا ہے' مگر منتہی کے ذہن میں کوئی بات مشکل نہیں معلوم ہوتی۔ مگر جسے عوام کی مختلف ذہنیتوں کا احاطہ کرنا ہوتا ہے' وہ انہی کی سطح پر آتا ہے' اور ان کی سمجھ

کے مطابق گفتگو کرتا ہے۔

پس آیاتِ مباحثہ میں اچھی توجیہ وہ ہے جس میں بحث و حجت کرنے والی جماعتوں کے طریقوں کا بیان ہو، اور اس میں وجہ الزام کی صراحت کی گئی ہو۔ آیاتِ احکام میں بہتر توجیہ وہ ہے جس میں مسائل کی مختلف صورتوں کی وضاحت کی گئی ہو اور قیود کے فوائد وغیرہ کا ذکر ہو۔ تذکیر بآلاءِ اللہ کی آیتوں میں بہتر توجیہ وہ ہے جس میں اللہ کی نعمتوں کی تصویر کشی کی گئی ہو، اور ان کے چھوٹے چھوٹے یا جزئی مقامات ظاہر کئے گئے ہوں۔ اسی طرح تذکیر بایّام اللہ کی آیتوں میں اچھی توجیہ وہ ہے جس میں واقعات باہم مرتب ہوں، اور ان میں جو تعریض (یا اشارے) ہوں ان کی وضاحت کا حق بھی ادا ہو جائے۔ موت اور اس کے بعد پیش آنے والے حالات سے متعلق آیات کی اچھی توجیہ وہ ہے جس میں اس وقت کی تصویر کھینچی گئی ہو، اور متعلقہ حالات کی توضیح ہو۔

فنونِ توجیہ میں یہ امر بھی شامل ہے کہ جو چیزیں نامانوس ہونے کی وجہ سے فہم سے دور ہیں، وہ قریب الفہم کر دی جائیں۔ دو دلیلیں جب ایک دوسرے کے خلاف ہوں۔ ان میں فیصلہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح دو تعریضوں اور معقول و منقول کے درمیان ٹکراؤ ہو تو اسے بھی دور کرنا چاہیے۔ دو مشتبہ چیزوں کا فرق ظاہر کر دیا جائے۔ اور حسبِ ضرورت دو مختلف باتوں میں مطابقت پیدا کی جائے۔ جس آیت میں کسی وعدے کی طرف اشارہ ہو اس کی سچائی ظاہر کی جائے۔ قرآنِ عظیم میں جس بات کا حکم دیا گیا ہو، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی کیفیت بتا دی جائے۔

الغرض صحابہ رضی اللہ عنہم کی تفسیر میں توجیہ بکثرت ہے۔ اس دشوار مقام کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا، جب تک دشواری کا سبب تفصیل سے نہ بیان کر دیا جائے۔ اس کے بعد دشواری کے حل پر مفصل گفتگو کی جائے۔ پھر اقوال کو تولا جائے۔

متکلمین نے متشابہات کی تاویل میں اور اللہ تعالیٰ کی صفات کی حقیقت کو بیان کرنے میں جو غلو کیا ہے، وہ میرا طریقہ نہیں ہے۔ میرا طریقہ وہ ہے جو امام مالک، امام ثوری، ابن مبارک اور تمام متقدمین کا تھا کہ اس قسم کی باتیں متشابہات میں سے ہیں، ان کی تاویل میں مبالغہ و کاوش سے احتراز کرنا چاہیے۔ استنباط کیے ہوئے احکام و مسائل پر جھگڑنا، اپنی روش کو صحیح ثابت کرنا اور

دوسرے کی روش کو باطل کرنا، اور قرآنی دلائل کو ٹالنے میں حیلہ سازی سے کام لینا یہ ساری باتیں میرے نزدیک غلط ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ ایسی کوئی حرکت قرآن کو ٹالنے کے مترادف نہ ہو۔

قرآن پڑھنے والے کو چاہیے کہ آیات کے اصل مفہوم کی تلاش کرے، اور اصل مفہوم کو اپنا مذہب بنائے۔ یعنی چلنے والا اسی کے موافق چلے۔ چاہے وہ کسی مذہب کے موافق ہو یا مخالف۔

قرآنی الفاظ کے معنی عربِ اول کے استعمال کے لحاظ سے لینا چاہیے۔ صحابہ اور تابعین کی روایات پر اعتماد کامل رکھنا چاہیے۔ قرآن مجید کے نحوی قاعدے میں عجیب خلل واقع ہو گیا ہے۔ اور وہ اس سبب سے کہ مفسرین کی ایک جماعت نے سیبویہ[1] کا مذہب اختیار کر لیا ہے۔ جو بات اس کے قاعدے پر پوری نہیں اترتی اُس میں وہ تاویل کر دیتے ہیں، اگرچہ وہ تاویل بعید ہو۔ یہ طریقہ میرے نزدیک غلط ہے۔ تفسیر کرنے والے کو چاہیے کہ جو بات مستحکم ہو اس کی پیروی کرے یعنی آیت کے سیاق وسباق کی رو سے جو بات موزوں معلوم ہو وہ صحیح ہے۔ چاہے وہ سیبویہ کا مذہب ہو یا فرا کا۔

حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) نے وَالْمُقِیمِینَ الصَّلٰوۃَ وَالْمُوتُونَ الزَّکٰوۃَ جیسے کلام کے بارے میں فرمایا تھا کہ ”عرب اپنی زبان کے لحاظ سے اسے ٹھیک ہی سمجھیں[2] گے“ فقیر کے نزدیک اس سے متعلق یہ تحقیق ہے کہ ”مشہور محاورے کے مخالف محاورہ بھی محاورہ ہی ہوتا ہے“۔ عرب اول اپنے خطبات اور گفتگو میں بکثرت ایسے محاورات استعمال کرتے تھے جو مشہور قاعدے کے خلاف ہوتے تھے۔ چونکہ قرآن عربِ اول کی زبان میں نازل ہوا ہے اس لیے کہیں واؤ کی جگہ ی، تثنیہ کی جگہ واحد اور مذکر کی جگہ مؤنث آ جائے تو کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے۔ اس لیے ثابت شدہ امر یہ ہے کہ وَالْمُقِیمِینَ الصَّلٰوۃَ کو حالتِ رفعی میں سمجھا جائے (یعنی: اَلْمُقِیمُونَ) واللہ اعلم۔

---

[1] سیبویہ۔ ابوبشر بن عثمان کا لقب ہے۔ اس نے عہد عباسیہ کے ابتدائی دور میں ”عربی نحو“ کے قواعد مرتب کئے۔ اسی طرح فَرّا بھی اس دور کا نحوی ہے۔

[2] عربی قواعد کے لحاظ سے مُقِیمِینَ کی حالت نصبی وجری ہے۔ اور مُوتون حالتِ رفعی میں ہے۔ عربی قواعد کا پابند یہاں پوچھ سکتا ہے کہ دونوں کلمے ایک حالت میں کیوں نہیں ہیں؟ حضرت شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے آگے اس کا معقول جواب دے کر شبہ کا ازالہ کر دیا ہے۔ (مترجم)

علمِ معانی و بیان صحابہؓ و تابعین کے زمانے کے بعد پیدا ہوئے اس لیے ان کی رو سے جو باتیں سمجھ میں آئیں۔ اور وہ عوام عرب کے موافق ہوں، وہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ مگر ایسی باریک بات جسے صرف اہلِ فن اور گہری معلومات رکھنے والے ہی سمجھ سکیں، اسے ہم تسلیم نہیں کرتے کہ قرآن یہی چاہتا ہے۔

اب رہے صوفیا کے اشارات و اعتبارات تو وہ فی الحقیقت فنِ تفسیر کا جزو نہیں ہیں۔ کوئی سالک جب قرآن سنتا ہے تو بعض باتیں اس کے قلب پر ظاہر ہوتی ہیں، وہ یا تو نظمِ قرآن سے متعلق ہوتی ہیں، یا اس حالت سے جس سے سالک متصف ہوتا ہے، یا اس علم و معرفت سے جو اسے اس وقت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی عاشق، لیلیٰ مجنوں کا قصہ سنے اور اس کی وجہ سے اس کی معشوقہ یاد آ جائے۔ اور ان واقعات کا منظر خیال کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے جو اس کے اور معشوقہ کے معاملے ہو چکے ہیں۔

یہاں ایک اہم بات ہے، جس سے مطلع رہنا مفید ہوگا، وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعبیرِ رؤیا کے فن کو معتبر قرار دیا ہے اور اس طریقے پر چلے ہیں۔ تاکہ علماءِ امت کے لیے سنت ہو۔ اور وہبی علوم کے لیے ایک دوسری راہ کا دروازہ کھل جائے۔ مثال کے لیے ذیل کی آیت پر غور کرو:

فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ

(۹۲: ۶)

"پھر جس نے عطا کیا اور پرہیزگاری کی اور نیکیوں کی تصدیق کی تو ہم اسے توفیق دیں گے آسائش کی۔"

ان آیاتِ شریفہ کو مسئلۂ تقدیر کی تمثیل میں بیان کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اصل مفہوم یہ ہے کہ جس نے نیک عمل کیے۔ اسے ہم جنت اور نعمات کی طرف لے جائیں گے۔ اور جو بدعملی کا مرتکب ہو اس کے لیے جہنم و عذاب کا دروازہ کھول دیں گے۔ لیکن فنِ تعبیر کی رو سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ہر شخص ایک مخصوص حالت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وہی حالت اس پر طاری ہوتی ہے۔ چاہے وہ واقف ہو، چاہے نہ ہو۔ اس اعتبار سے یہ آیت مسئلہ تقدیر سے مربوط ہو گئی۔

اسی طرح ذیل کی آیت کا مضمون ہے:

وَنَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (۹۱: ۸-۹)

"انسان کا نفس شاہد ہے، اور اس کی تکمیل بھی۔ اس کے دل میں ڈال دیا اس کی معصیت کو اور اس کی پرہیزگاری کو۔"

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو نیکی اور گناہ پر مطلع فرما دیا ہے لیکن نیکی اور معصیت کی صورتِ علمیہ کی پیدائش میں اور انسان میں نفخِ روح کے وقت اجمالاً نیکی اور معصیت پیدا کرنے میں ایک مشابہت ہے، اس اعتبار سے یہ آیت مسئلہ تقدیر پر بطور استشہاد پیش کی جا سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

❁ ❁ ❁

فصل سوم

قرآن کے نوادرات

قرآن کے نوادر جو احادیث میں بہت اہتمام کے ساتھ مذکور ہیں' اور فضیلت کے بیان سے مخصوص کیے گئے ہیں' کئی طرح کے ہیں۔ چنانچہ فنِ تذکیر بآلاء اللہ میں نادرہ وہ آیت ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفاتِ عظیمہ کی جامع ہو۔ مثلاً آیت الکرسی' سورۂ اخلاص' سورۂ حشر کی آخری آیات' سورۂ مومن کی ابتدائی آیت۔

فنِ تذکیر بایام اللہ میں آیتِ نادرہ وہ ہے جس میں کوئی ایسا قصہ ہو جس کا ذکر کم آیا ہو یا کسی معلوم واقعہ کو مزید تفصیل سے بیان کیا گیا ہو۔ یا ایسا قصہ مذکور ہو جس سے بہت بڑا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے' یا جس میں عبرت کے متعدد سبق ہوں۔ اسی لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت موسیٰ اور حضرت خضر (علیہما السلام) کے قصے کے بارے میں فرمایا: میری تمنا تھی کہ موسیٰ خضرؑ کے ساتھ صبر کرتے' تاکہ اللہ تعالیٰ ان دونوں کے قصے میں ہمیں اور زیادہ باتیں ظاہر فرماتا''۔

موت اور اس کے بعد ہونے والے حالات کی تذکیر کے لیے جو آیات ہیں ان میں آیتِ نادرہ وہ ہے جو حالاتِ قیامت کی جامع ہو۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے' اس سے کہو کہ وہ ''اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ'' والی سورت پڑھے۔

فنِ احکام میں آیتِ نادرہ وہ ہے جو حدود کے بیان پر مشتمل ہو اور جس میں سزا کے کسی خاص طریقے کا تعین ہو۔ مثلاً زنا کی حد میں سو کوڑے مارنے کا تعین۔ اور مطلقہ کی عدت میں

تین حیض یا تین طہر کا تعین۔ اسی طرح میراث کے حصے بخرے کا تعین۔

فنِ مخاصمہ (یا مباحثہ) میں آیتِ نادرہ وہ ہے، جس میں جواب کچھ ایسے عجیب انداز کا ہو جس سے شبہ پوری طرح رفع ہو جائے۔ یا اس میں گروہِ مخالف کا حال ایک واضح مثال کے ذریعے بیان کیا گیا ہو۔ جیسے کَمَثَلِ الَّذِیْ اسْتَوْقَدَ نَارًا والی آیت میں۔[1] اسی طرح کئی آیتوں میں بت پرستی کی برائی، خالق و مخلوق اور مالک و مملوک کے مراتب میں فرق عجیب مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ ریاکاروں اور شہرت کے حریصوں کے اعمال کے ضائع ہونے کا بیان کئی آیات میں بلیغ و مؤثر انداز میں ہے۔

قرآن کے نادرات مذکورہ مضامین ہی میں محدود نہیں ہیں۔ بسا اوقات کلام کی بلاغت اور اسلوب کی شگفتگی سے بھی غرابت وندرت پیدا ہوتی ہے۔ جیسے سورۃ الرحمٰن میں۔ اسی لیے اس سورت کا نام حدیث میں عروس القرآن آیا ہے۔ بعض اوقات شقی و سعید کے باہمی فرق کی تصویر کشی سے ندرت پیدا ہو گئی ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

لِكُلِّ اٰيَةٍ مِّنْهَا ظَهْرٌ وَبَطْنٌ وَلِكُلِّ حَدٍّ مَطْلَعٌ۔

قرآن کی ہر آیت کے ایک معنی ظاہری اور ایک معنی باطنی ہیں۔ اور ہر ایک حد کے لیے جھانکنے کی جگہ ہے۔

قرآن کے علومِ خمسہ کا ظاہر وہ چیز ہے جو اس کا مفہوم ہے۔ جن آیات میں اللہ کی نعمتوں کا ذکر ہے اس کا باطن ''اللہ کی نعمتوں میں غور و فکر اور صحیح مراقبہ'' ہے۔ علمِ تذکیر بایام اللہ کی آیات کا باطن یہ ہے کہ ان قصص و واقعات سے مدح و ذم اور ثواب و عذاب کی معرفت اور نصیحت حاصل ہو۔ جنت اور دوزخ کے بیان کرنے کا مقصد امید و بیم کی کیفیت پیدا کرنا، اور ان کو ''چشم دید'' جیسا بنا دینا ہے۔ احکام کی آیتوں میں ان کے مضمون اور اشاروں سے باریک احکام مستنبط کرنا، گمراہ فرقوں سے بحث و حجت کرنے میں ان قباحتوں کی اصل کو پہچاننا، اور ان

---

[1] پوری آیت شریفہ یہ ہے:

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَاحَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ○ (۲:۱۷)

''اُن کی مثال اُس جیسی ہے جس نے آگ سلگائی تو جب اس نے اس کے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ ان کی روشنی کو لے گیا، اور اُن کو اندھیروں میں چھوڑ دیا وہ نہیں دیکھتے ہیں۔''

کے ساتھ دوسری ویسی ہی قباحتوں کو شامل کرنا' یہ سب چیزیں آیات میں تفکّر سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور باطن میں داخل ہیں۔ پس کلامِ ظاہر پر اطلاع زبانِ عرب کے جاننے سے' اور فنِ تفسیر سے متعلق احادیث کے علم سے ہوتی ہے' اور اس کے باطن پر مطلع ہونے کے لیے لطافتِ ذہن' استقامتِ فہم' نورِ باطن اور حالتِ مطمئنہ کی ضرورت ہے۔ واللہ اعلم

فائدۂ جلیلہ

علمِ تفسیر کے وہبی علوم میں سے جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، انبیا علیہم السلام کے قصوں کی تاویل ہے۔ اس فن میں فقیر کا ایک رسالہ ''تاویل الاحادیث'' کے نام سے ہے۔ تاویل سے مراد (مطلب بیانی میں یہ بات مدِنظر رکھنا ہے) کہ جس زمانے میں اللہ تعالیٰ نے جو تدبیر چاہی اس کی رو سے ہر واقعہ کے لیے پیغمبر اور اس کی قوم کی استعداد کو اس کا ذریعہ بنایا۔ گویا اس آیت میں اسی بات کا اشارہ کیا گیا ہے:

وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ.

''تجھے تعلیم دے گا احادیث کے تاویل کی (یعنی خواب کی تعبیر کا علم دے گا)''۔

علومِ خمسہ کی تحقیق بھی علومِ وہبی سے ہے۔ اور یہ وہی ہے' جو قرآنِ عظیم کا اصلی مطلب ہے۔ اس کتاب کے شروع میں اس کا بیان ہو چکا ہے۔ اس کی طرف رجوع ہونا چاہیے۔

قرآن کا ترجمہ فارسی زبان میں اس طرح کرنا کہ وہ مقدار تخصیص اور تعیم وغیرہ میں عربی کے مشابہ ہو' یہ بھی علومِ وہبی میں سے ہے۔ ہم نے یہ کام ''فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القران'' لکھ کر کیا ہے۔ اگرچہ ہم نے بعض مقامات پر اس خوف سے کہ ناظرین بغیر تفصیل کے نہ سمجھ سکیں گے۔ اس کا التزام نہیں کیا ہے۔

اس کے علاوہ علمِ خواصِ قرآن بھی علومِ وہبی میں سے ہے۔ ایک جماعت نے اس سے متعلق دو طرح پر کلام کیا ہے۔ ایک تو دعا کے طور پر' اور دوسرے جادو کے مشابہ۔ استغفراللہ منہ۔ اس فقیر کے لیے جو دروازہ کھولا گیا ہے، وہ منقولہ خواص کے علاوہ ہے۔ میری گود میں ایک

مرتبہ تمام اسماءِ حسنٰی، آیاتِ عظمٰی، اور مبارک دعائیں رکھ کر فرمایا گیا کہ ''یہ ہمارا عطیہ ہے۔ تصریف کے لیے کارآمد ہے''۔ لیکن ہر آیت، ہر اسم اور دعا ایسی شرائط کے ساتھ مشروط ہے، جو کسی قاعدے میں داخل نہیں۔ بلکہ اس کا قاعدہ ''عالمِ غیب کا انتظار'' ہے۔ جیسا کہ حالتِ استخارہ میں ہوتا ہے کہ کسی آیت یا اسم کے ذریعہ عالمِ غیب سے اشارہ ہو جاتا ہے۔ تو اسی آیت یا اسم کو اس طریقہ سے پڑھا جاتا ہے جو اس فن والوں نے مقرر کیا ہے۔

یہ ہیں وہ مطالب جنھیں بیان کرنے کا ہم نے اس کتاب میں ارادہ کیا تھا۔

وَالْحَمْدُلِلّٰهِ اَوَّلًا وَّاٰخِرً ظَاهِرً وَّبَاطِنًا

فصل چہارم

حرُوفِ مقطّعاتِ قرآن

میرے وہم ضعیف پر جو علوم نزول فرمائے گئے ہیں ان میں حروفِ مقطّعات کے معانی کی تحلیل بھی ہے۔ اس کے سمجھنے کے لیے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ حروف ہجا سے عربی الفاظ بنتے ہیں۔ ہر حرف ایک مفرد معنی رکھتا ہے چونکہ وہ معنی نہایت نادر و عجیب ہوتا ہے' اس لیے اس کی تعبیر ''رمزِ اجمالی'' ہی سے کی جا سکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جن لفظوں کی ترکیب میں حروف یکساں یا ملتے جلتے ہوتے ہیں' وہ اکثر معنی میں یا تو متفق ہوتے ہیں یا قریب المعنی۔ مثلاً ماہرین ادب نے کہا ہے کہ جن لفظوں میں ن اور ف ایک ساتھ آتے ہیں' ان میں کسی نہ کسی طرح سے ''خروج'' کا مفہوم ہوتا ہے۔ جیسے نفر[1]، نفث، نفخ، نفق، نفد، نفذ اور جہاں ف اور ل یکجا ہوں وہاں پھٹنے کے معنی پائے جائیں گے۔ جیسے فلق[2]، فلح، فلج، فلد، فلذ۔

دوسرے یہ کہ عرب اکثر ایک کلمہ کو تبدیلِ حروف سے کئی طرح بولتے ہیں مثلاً دق کو دک' لج کو لز۔

۱۔ نَفَرٌ۔ آدمیوں کا ایک دستہ جس میں تین سے دس تک افراد ہوں۔ منیٰ سے حاجیوں کا خروج۔ نَفَثٌ۔ پھونکنا۔ کسی چیز میں کوئی چیز ڈالنا۔ نَفحٌ۔ خوشبو کا نکلنا۔ رگ سے خون کا نکلنا۔ نَفخٌ۔ پھونکنا، پیدا کرنا۔ نَفَقٌ۔ گم ہونا۔ ختم ہو جانا۔ نَفَدٌ۔ نیست و نابود ہونا۔ چلا جانا۔ ختم ہو جانا۔ نَفَذٌ۔ کسی چیز کا جاری ہونا۔ کسی چیز سے کسی چیز کا نکلنا۔

۲۔ فلقٌ۔ پھٹنا۔ فلجٌ۔ زراعت کے لیے زمین کو جوتنا۔ حصہ بخرا کرنا۔ آدھا آدھا کرنا۔ چھٹکارا پانا۔ فلحٌ۔ زراعت کے لیے زمین میں ہل چلانا۔ فلذٌ۔ کوئی ٹکڑا یا حصہ جدا کرنا۔ (مترجم)

الغرض ایسے کئی شواہد ہیں۔ یہاں ہمارا مقصد صرف آگاہ کرنا ہے۔ ایسے الفاظ سب عربی ہی ہوتے ہیں۔ مگر عرب ان کی اصلیت اور تحقیق سے واقف نہیں ہوتے۔ بلکہ علماءِ نحو بھی نہیں جانتے۔ عربوں سے جنس، معرفہ، خواص اور ترکیبِ جملات کے بارے میں دریافت کریں تو وہ کچھ نہیں بتا سکیں گے، مگر وہ ان چیزوں کا استعمال اپنی بول چال میں کرتے رہتے ہیں۔

پھر عربی زبان کی باریکیوں کو جاننے والے بھی ایک طرح کے نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض کا ذہن بہت لطیف ہوتا ہے اور بعض کا یہ حال ہوتا ہے کہ دوسروں نے اپنی تحقیق سے جو باتیں دریافت کی ہیں، وہ ان تک بھی نہیں پہنچ پاتے۔

حروفِ مقطعات کا علم بھی عربی علمِ لغت سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر اکثر محققین ان کے مفہوم کی تحقیق سے قاصر ہیں۔ قرآن کے حروفِ مقطعات سورتوں کے نام ہیں۔ اس لحاظ سے کہ وہ مجمل طور پر اس مضمون کو ظاہر کرتے ہیں جو سورت میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہو۔ اسی طرح جس طرح کسی کتاب کا نام کسی ایسی چیز پر رکھ دیا جاتا ہے جس سے اس کتاب کی حقیقت ذہنِ سامع پر واضح ہو جائے۔ مثلاً بخاری نے اپنی کتاب کا نام "**جامع الصحیح المسند فی الحدیث رسول اللہ**" رکھا ہے۔

پس الٓمٓ کے معنی ہیں: غیر متعین غیب متعین ہو گیا عالمِ شہادت (یعنی عالمِ ظاہری) کی طرف جو مادی ہے۔ اس رو سے کہ ہمزہ اور ہ دونوں غیب کے معنی میں ہیں۔ مگر ہ اس عالم کا غیب ہے، اور ہمزہ عالمِ مجرد کا۔ اسی لیے استفہام کے وقت "أ" اور "أم" کہتے ہیں۔ اور عطف کی صورت میں "أوَ"۔ اس کا سبب یہ ہے کہ استفہام کی صورت میں بات "امرِ منتشر" ہوتی ہے اور پوشیدہ (یا غیب) ہوتی ہے متعین (یا عالمِ ظاہر) کے حق میں۔ اسی طرح اس استفہام کے جواب میں جو بات لوٹتی ہے، وہ بھی غیب (یعنی پوشیدگی) ہی سے آتی ہے۔

فعل امرِ حاضر کے شروع میں ہمزہ آتا ہے، وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حکم کرنے والے کے دل میں ایک صورت بندھی ہوئی ہے۔ جس کی تفصیل ایک خاص فعل کا مادّہ ہے۔ ضمائر میں ہ کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ وہ اس عالم کا غیب ہے۔ اور اس سے متعیّن کے لیے ایک "اجمال" حاصل ہوتا ہے۔

لام تعیّن کے معنی رکھتا ہے۔ اسی لیے معرفہ بنانے میں اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔

میم سے چونکہ دونوں ہونٹ مل جاتے ہیں' اس لیے یہ حالت دلالت ہے، اس بات پر کہ ایک مادی چیز میں مختلف حقائق مجتمع ہیں' اور عالمِ مجرد سے عالمِ تقید میں آ کر بند ہو گئے ہیں۔

پس الــم' کنایہ ہے فیضِ مجرد سے جو عالمِ تقید میں آ کر بنی آدم کے عادات وعلوم کے مطابق متعین ہو گیا ہے۔ ان کی قساوتِ قلب کو تذکیر کے مقابل کر دیا۔ پھر پوری سورت میں فاسد اقوال اور برے اعمال کے مقابل مخاصمہ اور نیکی و گناہ کی حد بندی کر کے تصادم پیدا کر دیا۔

الــرٓا' الٓم کی طرح ہے۔ مگر اس میں راؔ لوٹنے کا مفہوم رکھتا ہے۔ یعنی جو میں مادے میں آ کر متعین ہو گیا ہے۔ وہ دوسرے زمرے کے مادے میں آ کر پھر متعین ہو گیا ہے۔ اس (الــرا) میں میم شامل ہو تو اس میں وہی مفہوم ہو جاتا ہے جو اوپر مذکور ہوا ہے۔ یعنی بنی آدم کی برائیوں سے تصادم کے لیے کنایہ ہوتا ہے۔ انبیاء کے واقعات' کیے بعد دیگرے ان کی گفتگو اور ان کے سوال و جواب کی تکرار سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔

طٓ اور صٓ' دونوں سے مراد عالمِ مادی سے عالمِ بالا کی طرف اٹھنے کی حرکت مراد ہے۔ مگر طٓ متحرک کی مادّیت و آلودگی یا اس کی بڑائی اور موٹائی پر دلالت کرتی ہے۔ اور صٓ اس کی صفائی اور لطافت پر۔

سٓ سے مراد سرایت کرنا اور تمام آفاق میں پراگندہ ہونا ہے۔ پس طــٰـہ' مقامِ انبیاء ہے۔ جو اُن کے عالمِ اعلیٰ کی طرف متوجہ ہونے کے آثار ہیں' تاکہ اس عالم میں بیانِ اجمالی سے اور کتابوں کے مذکور سے صورتِ غیبی پیدا ہو۔

طسٓمٓ سے مقاماتِ انبیا مراد ہے۔ جو ان کی فوقانی حرکات کے آثار ہیں۔ جو عالمِ مادی میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ اور آفاق میں منتشر ہیں۔

حٓ وہی ہ ہے' جس کے معنی اوپر بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن جب وہ خلقت' ظہور و تمیز بھی رکھتی ہو، تب اسے حٓ سے تعبیر کرتے ہیں۔ پس حٓمٓ' ایک نورانی اجمال ہے جو عالمِ مادی کے خصائص میں باطل عقائد اور فاسد اعمال سے پیوست ہو گیا ہے۔ اور یہ کنایہ ہے ان کے اقوال کی تردید سے اور ان کی عادات و مناظرات کے شبہات میں ظہورِ حق سے۔

عٓ' دلالت کرتا ہے نیک اور حسین ظہور پر۔ اور اس کے متعین ہونے پر۔ اور قٓ میم کی

طرح دلالت کرتا ہے اس عالم پر لیکن قوت وشدت کے لحاظ سے اس سے بڑھا ہوا ہے۔ اور میم صورتوں کے اجتماع کی رو سے اور تراکمُ کے اعتبار سے بڑھی ہوئی ہے۔ پس عشقِ حق کا جلوہ عالم مادی میں ساری ہے

نٓ سے مراد ایک ایسا نور ہے جو ظلمت میں سرایت کئے ہوئے اور پراگندہ ہے۔ اس کی حالت ایسی ہوتی ہے، جیسے صبحِ صادق کے وقت یا غروبِ آفتاب کے قریب ہوا کرتی ہے۔ یٓ بھی اسی کے مثل ہے مگر یٓ میں یہ نور اس کی بہ نسبت بہت کم سمجھا جاتا ہے۔ اور تعین ہٓ کی بہ نسبت بہت کم ہوتا ہے۔ پس یٰسٓ کنایہ ہے ایسے معنی سے جو عالم میں منتشر ہو۔ صٓ وہ ہیئت ہے جو پروردگار کی طرف انبیا کے متوجہ ہونے کی حالت میں جبلی یا کسبی طور پر پیدا ہوتی ہے۔ قٓ، وہ قوت، شدت اور جبر ہے جو اس عالم میں متعین ہے۔ جیسے کوئی یہ کہے کہ میرا مقصد یہی شکل ہے جو اس عالم میں ٹوٹ پھوٹ یا تصادم سے پیدا ہوئی ہے۔ 'کٓ' قاف ہی کی طرح ہے۔ مگر اس میں قوت کم ہے۔ پس کھٰیٰعٓصٓ کے معنی عالمِ مادی ظلمانی کے ہیں جس میں بعض علومِ جمیل وکثیف متعین ہو گئے ہیں، اور پروردگارِ اعلیٰ کی طرف رجوع ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان کلمات کے معانی بطریقِ ذوق سمجھائے گئے ہیں۔ ان کے اجمالی معانی جو تحریر کئے گئے ہیں، ان سے زیادہ بیان کی طاقت نہیں ہے۔ اگرچہ یہ تسلیم ہے کہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے یہ مضمون ناکافی ہے، بلکہ ایک اعتبار سے اسے مختلف کہا جا سکتا ہے۔

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

ترجمہ رسالہ اصول تفسیر

مصنفہ
علامہ ابن تیمیۃ الحرانیؒ
توضیح وترجمہ
خالد ابن القاسم انصاری

پیش لفظ

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ نادر رسالہ قارئین کرام کے ملاحظہ میں پیش ہے۔ موصوف نے قرآن کی تفسیر سمجھنے کے اصول اپنے دور کے پیشِ نظر واضح فرمائے ہیں۔ آپ کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے الفوز الکبیر فی اصول التفسیر مرتب فرمائی، اس رسالہ میں پانچ باب قائم کیے۔

باب اول: ان علومِ پنجگانہ کے بیان میں جن کی جانب قرآنِ عظیم نے صراحت کے ساتھ رہنمائی کی ہے۔ گویا قرآن مجید کے نزول کا مقصد وہی علومِ پنجگانہ ہیں۔

باب دوم: وجوہ خفاءِ نظمِ قرآن کے بیان میں اور ان وجوہ کا علاج وضاحت کے ساتھ۔

باب سوم: نظمِ قرآنی کے لطائف اور اس کے اسلوبِ بدیع کی تشریح بحدِّ امکان۔

باب چہارم: فنونِ تفسیر

باب پنجم: متفرق۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے امتدادِ زمانہ کے لحاظ سے اصولِ تفسیر میں ندرت پیدا فرمائی۔ یہ رسالہ بھی مختصر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں زیادہ تر آیات محکمات ہیں جو اصولِ دین اور احکامِ شریعت سے تعلق رکھتی ہیں۔ انبیائے کرام اور امِم سابقہ کے عبرت انگیز قصص ہیں ان کا سمجھنا جمہور کے لیے آسان ہے۔ مگر اسی کے ساتھ آیات متشابہات اور حقائقِ غامضہ بھی ہیں جن کو صرف ''راسخون فی العلم'' ہی سمجھ سکتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ میں ایسے حضرات کی کمی نہ تھی، مگر ان کی نگاہوں میں عام طور پر اس کا عملی پہلو غالب تھا۔ ظاہری اور عملی حیثیت کے علاوہ قرآنِ کریم کی نظری اور عقلی حیثیت بھی اہم ہے۔ چونکہ قیامت تک کے لیے یہ امتِ اسلامیہ کا دستور العمل ہے اور ہر زمان و ہر مکان میں یہ شمعِ ہدایت ہے، اگر یہ ایسے حقائق جاودانی پر مشتمل نہ ہوتا تو کیوں کر ان کا دائمی نصابِ ہدایت بننے کی صلاحیت رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن سے عملی نصیحت و رشد و ہدایت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں تفکر و تدبر کی بھی

تاکید ہے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ.

"اور ہم نے تیری طرف قرآن اتارا تاکہ لوگوں کے لیے جو اُتارا گیا ہے اس کی وضاحت ان کے سامنے بیان کردو تاکہ لوگ اس میں تفکر کریں۔

اہلِ نظر کو قرآن نے اپنی آیات میں فکر ونظر کی دعوت دی ہے تاکہ وہ اپنی فلاح کا راستہ نکالتے رہیں۔ یہی وجہ تھی کہ عہدِ نبویؐ میں فقہائے صحابہ تدبر فرماتے رہتے تھے۔ ابوعبدالرحمٰن اسلمی سے روایت ہے کہ صحابہ حضور علیہ السلام سے دس آیتیں سیکھتے تھے تو جب تک ان کی علمی و عملی حقیقت کو جان نہیں لیتے تھے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:
ہم میں سے جب کوئی سورۂ بقرہ و آلِ عمران پڑھ لیتا تھا تو ہماری نظروں میں بڑا سمجھا جاتا تھا۔
(مسند امام احمد)

اکثر صحابۂ کرام بنظرِ احتیاط انہیں معانی پر اکتفا فرماتے تھے جو بعض آیاتِ قرآنی کی تشریح کے متعلق حضور علیہ السلام سے معلوم ہو جاتے تھے، خود قرآن کی تفسیر کرنے سے احتراز فرماتے تھے۔ ان کے نزدیک جو چیز ناجائز تھی وہ یہ تھی کہ بلا حقیقت کو پہنچے اور اچھی طرح سمجھے ہوئے آیات کی تفسیر کی جائے۔ اس دور میں تفسیر کے لیے عربی زبان، جاہلیت کے رسوم وعادات جن کو قرآن نے مٹایا ہے، عہد رسالت کے واقعات جن کا تعلق نزولِ آیاتِ قرآنی سے ہے۔ حضور علیہ السلام کے ارشادات، اعمال وقضایا کا جاننا لازمی تھا۔ وہ انہیں کی مدد سے آیات کی تشریح کرتے تھے۔

قرآن مجید میں دینی تعلیم کے علاوہ ایسے تاریخی حقائق بھی بیان فرمائے گئے ہیں جن کا علم اصلاحِ نفوسِ بشری کے لیے ضروری ہے۔ مثلاً عالم کی تکوین، حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش۔ انبیاءِ کرام اور امم سابقہ کے واقعات اور حالات۔ عہدِ صحابہ میں ان کو ان علماءِ اہلِ کتاب سے جو اسلام لا چکے تھے دریافت کیا جاتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی ایسے واقعات "کعب احبار" سے اخذ کئے تھے۔ اگرچہ حضور علیہ السلام نے آگاہ فرما دیا تھا کہ اہلِ کتاب کے اقوال کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب۔ چونکہ ان امور کا تعلق اعمالِ شریعت سے نہ تھا اس وجہ سے ان کے اقوال لینے میں حرج نہیں سمجھا گیا۔ اس بناء پر اہل کتاب کی روایتیں

بھی تفسیر میں شامل ہوگئیں۔ علامہ ابن خلدون مقدمہ میں فرماتے ہیں:

''ایسی روایتوں کا تعلق احکامِ شرعیہ سے نہ تھا۔ تدوین کے وقت مفسروں نے مسامحت سے کام لے کر ان کی تنقید کی طرف توجہ نہیں کی اور انہیں کو کتبِ تفسیر میں درج کر دیا۔''

عہدِ نبوی میں اہلِ کتاب میں سے جو حضرات اسلام لائے، ان میں سب سے پہلے یہودی عالم حضرت عبداللہ بن سلام ہیں جو ہجرت کے بعد ہی مدینہ میں اسلام لائے۔ ان کا انتقال ۴۳ھ میں ہوا۔ ان سے حضرت ابو ہریرہؓ و حضرت انس بن مالکؓ نے روایتیں کی ہیں۔ دوسرے حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ۔ یہ اصلاً مجوس تھے۔ یہ تلاشِ حق میں سرگرداں تھے۔ آسمانی کتابوں کا علم حاصل کر چکے تھے۔ جب عرب آئے تو بنی کلب نے غداری سے ان کو غلام بنالیا اور فروخت کر ڈالا۔ مدینہ منورہ پہنچے، وہاں اسلام لائے اور مقربِ بارگاہِ نبوی ہو گئے۔ اہلِ فارس نے اسلام لانے کے بعد حضرت سلمان فارسی کو اپنی قوم کا پیش رو قرار دیا۔ ان کے حالات میں غیر معمولی باتیں بڑھائیں اور ان کی جانب بہت سی روایتیں منسوب کیں۔ بالخصوص صوفیہ عجم نے جو اکثر اپنا سلسلۂ ارادت آپ تک پہنچاتے ہیں۔ تیسرے صحابی حضرت تمیم داری ہیں جو ۹ھ میں مدینہ میں حاضر ہو کر مسلمان ہوئے۔ یہ یمن کے نصاریٰ میں سے تھے اور وہاں قصہ گوئی کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں انہوں نے قصہ گوئی کی اجازت چاہی، مگر آپ نے اجازت نہ دی۔ ان کے غیر معمولی اصرار پر اس قدر اجازت دی کہ صرف جمعہ کے دن قبل اس کے کہ میں مسجد میں آؤں، تم قصے سنالیا کرو۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ان کو ہفتہ میں دو دن کی اجازت مل گئی۔ (اصابہ جلد ا ص ۸۴) جساسہ اور دجّال کی بعض روایتیں اس سے مروی ہیں۔

عہدِ صحابہ کے بعد روایتِ تفسیر میں ان حضرات نے شہرت پائی۔ حضرت عبداللہ بن عباس متوفی ۱۰۵ھ۔ حضرت عکرمہ مولیٰ مزاحم متوفی ۱۰۵ھ۔ حضرت عطاء بن ریاح متوفی ۱۱۴ھ۔ حضرت ضحاک بن حضرت حسن بصری متوفی ۱۱۰ھ۔ حضرت سعید بن جبیر متوفی ۹۵ھ۔ حضرت مجاہد بن جبیر متوفی ۱۰۳ھ اور ربیع بن انس اور عوفی وغیرہم علماءِ تفسیر میں ممتاز ہیں۔ ان کے علاوہ امام مسروق، زید بن اسلم، قتادہ، ابو العالیہ، اس عہد میں اسرائیلیات کا اضافہ ہوا چونکہ

نو م نے اس کو علمی تحقیق سمجھ لیا تھا۔ اس لیے چھوٹی چھوٹی غیر ضروری باتیں دریافت کرتے
تھے۔ مثلاً حضرت نوحؑ کی کشتی کا طول و عرض، اس میں کن کن جانداروں کے جوڑے تھے۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں چاروں پرندوں کی اقسام، حضرت خضر کے واقعہ کی
تفصیل۔ حضرت یوسفؑ کے واقعہ کی تشریح۔ حضرت موسیٰؑ کی بیوی کے متعلق کہ وہ حضرت
شعیبؑ کی چھوٹی لڑکی تھیں یا بڑی۔ اصحاب کہف کے نام، ان کے کتے کا رنگ وغیرہ وغیرہ۔
ان باتوں کی وضاحت کو تفاسیر میں درج کیا گیا۔ ان روایات کا مدار دو شخصوں پر رکھا گیا۔ ایک
حضرت کعب احبار جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلام لائے دوسرے حضرت وہب بن منبہ یہ
یمن کے یہودی مگر فارسی الاصل تھے۔ امام ابن جریر طبری نے اگرچہ ان سے قطعی پرہیز تو نہیں
کیا۔ مگر بہت کم روایتیں لی ہیں لیکن ثعلبی وغیرہ نے انبیاء کے قصوں میں زیادہ تر انہیں کی
روایتیں درج کی ہیں۔

تابعین کے بعد اتباعِ تابعین میں مفسر زیادہ ہوئے۔ جیسے عطاء بن دینار متوفی ۱۲۶ھ،
مقاتل بن سلیمان متوفی ۱۵۰ھ۔ سفیان ثوری متوفی ۱۶۱ھ، وکیع بن جراح متوفی ۱۹۶ھ، سفیان
بن عیینہ متوفی ۱۹۸ھ۔ نیز اسحاق بن راہویہ، عبدالرزاق امام مالک وغیرہم بھی ہیں۔ ان
حضرات نے بصحتِ سند تفاسیر کو مرتب کیا مگر افسوس آج امت کے سامنے ان میں سے کوئی
تفسیر موجود نہیں ہے۔

تبع تابعین کا سلسلہ دوسری صدی کے خاتمہ تک پہنچتا ہے۔ اس کے بعد ان کے
شاگردوں کا زمانہ آتا ہے۔ تیسری صدی ہجری میں تدوینِ کتب کا سلسلہ عام ہوگیا اور اسی زمانہ
میں ائمہ حدیث نے جرح و تعدیل کے سلسلہ کو جاری کیا۔ تفسیری روایات کا بڑا حصہ ضعفِ رواۃ
کی وجہ سے مشکوک ثابت ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اکابر آئمہ جیسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ و امام
احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیری روایتوں پر علانیہ شک و شبہ کا اظہار کیا۔ حضرت ابن عباس
رضی اللہ عنہما جن کی روایتوں کی تعداد ۱۶۶۰ ہے، ان میں سے امام شافعی کے نزدیک چھ سو
روایتیں صحیح ہوں گی۔ (اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۹۶) حضرت ابن عباس سے جتنے طریقوں پر روایتیں
ہیں۔ ان میں سب سے معتبر سند ابن صالح عن علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس ہے۔ مگر محدثین
فرماتے ہیں کہ علی بن ابی طلحہ کی ملاقات حضرت ابن عباس سے ثابت نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کہتے

ہیں وہ مجاہد اور سعید بن جبیر کی روایتیں ہوتی ہیں۔ امام مجاہد، سعید بن جبیر اور عکرمہ وغیرہم کی سند سے جو روایتیں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہوں اور ان حضرات کے شاگرد بھی غیر مجروح ہوں تو ایسی روایتیں قابلِ اعتبار ہیں۔

تیسری صدی ہجری میں متعدد مستند اور معتبر تفسیریں مرتب ہوئیں مثلاً تفسیر امام ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ، تفسیر ابن منذر متوفی ۳۱۸ھ، تفسیر ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ، تفسیر امام حاکم متوفی ۳۵۹ھ، تفسیر ابن حیان ۳۶۹ھ۔ یہ مشہور و ممتاز تفاسیر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے صحابہ و تابعین کی روایتیں مع سند درج کی ہیں۔ خود کسی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ بجز امام طبری کے جن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر آیت کے ایک ایک لفظ کے معانی لکھتے ہیں، متقدمین کے اختلافات کو بیان کرتے ہیں اور ہر بات سند کے ساتھ مروی ہوتی ہے۔ پھر خود اس میں ترجیحی بات کو مع دلائل بیان کرتے ہیں۔ کہیں استنباطِ مسائل اور وجوہِ اعراب سے بھی بحث کرتے ہیں۔ ان کی تفسیر اسلام میں پہلی مستند تفسیر ہے۔ امام نووی نے فرمایا ہے کہ امت کا اجماع ہے کہ ابن جریر طبری جیسی تفسیر کسی نے نہیں لکھی۔ حافظ ابن کثیر نے اسی کا خلاصہ اور تنقیح کر کے اپنی تفسیر مرتب کی ہے، اور علماءِ سابقین کی تفسیریں معدوم ہیں۔

چوتھی صدی ہجری میں مختلف قسم کی علمی تحریکات پیدا ہوگئیں۔ صرف، نحو، بلاغت و معانی، فقہ و اصولِ فقہ، منطق و فلسفہ، کلام و تصوف۔ اس لیے اس صدی میں فنی زاویۂ نظر سے الفاظ و آیات کی تشریح میں بحثیں شروع ہوئیں۔ مثلاً زجاج و کسائی نے جو صرف و نحو کے امام تھے۔ تفسیروں میں لفظی تصرفات اور وجوہِ اعراب سے بحث کی۔ ثعلبی و ابن اثیر نے جن کو تاریخ کا ذوق تھا، قصص کی طرف رجحان رکھا۔ فقیہ ابواللیث سمرقندی اور علامہ قرطبی نے فروعاتِ فقہیہ پر استدلال میں توجہ صرف کی۔ ابو مسلم اصفہانی و زمخشری نے معتزلی عقائد کے اثبات کی کوشش کی۔ اسفرائنی اور امام رازی نے متکلمانہ بحثیں کیں۔ عبدالقادر جرجانی اور ابو ہلال عسکری نے بلاغت و معانی کے لطائف ظاہر کیے۔ شیخ محی الدین بن عربی اور واحدی نے تصوف کو نمایاں کیا۔

غرضیکہ ہر زمانہ کی تفسیر اس زمانہ کی علمی بحثوں اور تحریکوں سے متاثر اور ہر فرقہ کی تفسیر اس کے عقائد و خیالات کا آئینہ نظر آتی ہے۔ کشف الظنون نے نو سو (۹۰۰) تفسیروں کا ہونا ظاہر کیا اور نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم نے اکسیر میں اس سے بھی زیادہ تعداد بتائی

ہے۔

اس دور میں شیخ جوہر طنطاوی کی تفسیر مغربی علوم کے پیش نظر مرتب ہوئی ہے۔ لیکن ابن جریر طبری اور علامہ ابن تیمیہ کے نقشِ قدم پر شیخ محمد عبدہٗ واستاذی علامہ سید رشید رضا علیہم الرحمہ کی تفسیر ہے۔ جو افسوس ہے کہ نصف قرآن تک مرتب ہو سکی ہے۔ بہر حال ایک باخبر عالم کے لیے علامہ ابن تیمیہ کا یہ رسالہ شمع ہدایت ہے۔

احقر الانام

خالد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اکتوبر ۱۹۴۸ء میں اعلیٰ حضرت حضور معلّٰی حاجی نواب محمد حمید اللہ خان صاحب بہادر فرمانروائے بھوپال کی معیت میں حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ کی حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ اعلیٰ حضرت نے مدینہ منورہ کے علماء و فضلاء کے لیے گراں بہاء رقم مجھے عطا فرمائی۔ منجملہ اور حضرات کے جب میں نے اس نذر کو علامہ شیخ محمد نصیف کی خدمت میں پیش کیا تو موصوف نے بکمال خلوص و محبت اس کو قبول فرماتے ہوئے مجھ کو اپنے مکان پر یاد فرمایا۔ وہاں منجملہ اور علمی مذاکرات کے حضرت فضیلۃ الاستاذ الشیخ جمیل آفندی الشطی مفتی الحنابلہ بدمشق کی زیارت اور ان کے علمی فیوض سے مستفیض ہوا۔ حضرت مفتی صاحب نے مجھ کو ایک نسخہ مقدمہ فی اصول التفسیر مصنفہ شیخ الاسلام تقی الدین ابی العباس احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام بن تیمیۃ الحرانی عنایت فرمایا اور یہ بھی مشورہ دیا کہ میں اس کا اردو ترجمہ شائع کر کے عام مسلمانوں کے لیے پیش کروں۔ معز موصوف نے زبانی جو اس رسالہ کے متعلق فرمایا، وہی تحریر میں بھی ہے جو اس کے ابتدا میں ایک صفحہ پر درج ہے، ان سب کا ماحصل یہ ہے۔

> "یہ رسالہ ۱۲ے ھ کا لکھا ہوا ہمارے پاس تھا اور جگہ جگہ کٹا پھٹا اور مٹا ہوا بھی تھا۔ اس کی اطلاع استاذ علامۃ الشیخ طاہر الجزائری کو ہوئی۔ حسن اتفاق کہ ان کے پاس بھی اس کا ایک نسخہ آ گیا وہ بھی کٹا ہوا تھا تاہم دونوں نسخوں کے مقابلہ کے بعد ہم نے ۱۳۱۸ ہجری میں اس کو مکمل کیا اور یہ واقعہ ہے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر رسالہ ہم نے نہیں دیکھا۔" یہ رسالہ ۳۴ صفحات پر ۱۹۳۶ء میں دمشق میں شائع ہوا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت سرکار عالی کی معیت میں جہاں بیشتر علمی فوائد حاصل ہوئے منجملہ ان کے ایک یہ انعام بھی ہے۔ اس سفر کے سلسلہ میں مجھے سرکار عالی کے ذوقِ علمی و دقتِ

فکر ونظر نے اس پر آمادہ کیا کہ میں اپنی لیفات ملک وقوم کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں۔

چنانچہ جہاں اور کتابیں پیش ہوں گی وہاں یہ ترجمہ بھی بعض ضروری اضافوں کے ساتھ پیش ہے۔ میری یہ سعی بھی جاری ہے کہ علامہ ابن تیمیہ کی تفسیر بھی حاصل ہو سکے۔ اصل عربی رسالہ انشاء اللہ میں جلد شائع کروں گا۔

خالد

اتوارہ۔ بھوپال

جولائی ۱۹۵۱ء

مختصر تذکرۂ علامہ ابن تیمیہؒ

احمد نام، ابوالعباس کنیت، تقی الدین لقب، ابن تیمیہ عرف۔ سلسلہ نسب یہ ہے:
احمد بن شہاب الدین عبدالحلیم بن عبدالسلام ابن ابی محمد عبداللہ بن ابی القاسم الخضر بن محمد بن الخضر بن عبداللہ بن تیمیہ۔

دمشق کے علاقہ میں حران ایک مشہور مقام ہے۔ یہ یہیں کے رہنے والے تھے۔ ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ دوشنبہ کے دن پیدا ہوئے۔ ۲۱ سال کی عمر میں تمام علوم سے فارغ ہوگئے۔ ۲۰۰ سے زائد آپ کے شیوخ تھے۔ ۶۹۰ھ میں قاضی القضاۃ کا منصب پیش کیا گیا۔ مگر آپ نے انکار کر دیا۔ ۶۹۱ھ میں حج کو تشریف لے گئے۔ مکہ مکرمہ کی ساری فضا آپ کے علم و فضل سے گونج اٹھی۔

حضرت امام ابتدا ہی سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرض کو ادا کرتے رہے۔ اہل تصوف وصوامع کی بدعات و محدثات کو واشگاف کیا، جس سے بڑی بڑی خانقاہوں میں کھلبلی مچ گئی۔ علماءِ سوء بھی آپ کے دشمن تھے اور آپ کے علمی اقتدار کو بڑھتا ہوا دیکھ کر سب نے متحد ہوکر آپ سے کئی بار مناظرہ کیا۔ مگر ہر مرتبہ شکست کھائی۔ تاہم ان کا حربہ اس لیے کارگر ہوا کہ عوام کو گمراہ کرنے کا طریقہ اس قدر آسان ہے کہ جہاں کسی محقق و مجدّد کی تحقیر مقصود ہوتی ہے تو ایسے علماء اس کو ملحد، آزاد خیال، گمراہ کن کے الفاظ سے بدنام کرتے ہیں۔ یہی حربہ آپ کے خلاف بھی استعمال ہوا اور آپ کو چار پانچ مرتبہ قید کیا گیا۔ ۷۰۹ ہجری میں سلطان ناصر نے آپ کو قاہرہ بلوایا۔ ۱۸ شوال کو آپ دمشق سے قاہرہ پہنچے۔ ۲۴ شوال کو سلطان ناصر نے دربار منعقد کیا۔ تمام علماء کو بلایا اور ان سب کے سامنے جب آپ دربار میں آئے تو سلطان نے سروقد آپ کی تعظیم کی اور اپنے پاس بٹھایا۔ پھر آپ کے علم و فن کی بے حد تعریف کی سلطان کا منشا یہ تھا کہ علماء کے دل سے آپ کی عداوت دور ہوجائے اور یہ بھی منشا تھا کہ اگر علماء نے اپنی روش نہ بدلی تو پھر ان کو سزا دی جائے۔ چند دن کے بعد سلطان نے آپ سے مشورہ کیا۔ آپ نے اپنے مخالفوں کی

بے حد تعریف کی اور فرمایا کہ اگر یہ لوگ نہ رہے تو پھر سلطنت میں ان کی جگہ خالی ہی رہے گی۔ سلطان اس عالی ظرفی سے اور بھی متاثر ہوا۔ لیکن علماء نے ہمیشہ عوام اور خواص کو حضرت امام کے خلاف برانگیختہ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ متعدد بار آپ کو قید میں رکھا گیا۔ آپ قید خانہ میں فرمایا کرتے تھے۔ قید میری خلوت ہے، قتل میری شہادت ہے اور جلاوطنی میری سیاحت ہے۔

۲۰ ذیقعدہ ۷۲۸ ہجری دوشنبہ کی رات میں آپ کا انتقال دمشق کے قید خانہ میں ہوا۔ نماز جنازہ سب سے پہلے شیخ محمد بن تمام نے قلعہ میں پڑھائی۔ اس کے بعد دوسری نماز جنازہ جامع مسجد میں پڑھائی گئی۔ تیسری نماز جنازہ شہر سے باہر ہوئی اور ڈھائی تین لاکھ آدمیوں نے جنازہ کی نماز پڑھی۔

حضرت امام کی تصانیف:

چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد چار پانچ سو بتائی جاتی ہے۔ ان میں سے جو کتابیں چھپ چکی ہیں، وہ یہ ہیں۔

فتاوی ابن تیمیہ .... ۵ جلد

رسائل کبری .... ۲ جلد

سبعہ رسائل .... ۱ جلد

منہاج السنۃ .... ۴ جلد

کتاب الوسیلۃ .... ۱ جلد

کتاب العقل والنقل .... ۱ جلد

صارم المسلول .... ۱ جلد

الفرقان .... ۱ جلد

رد نصاری .... ۱ جلد

تفسیر سورۃ النور .... ۱ جلد

ایضاح الدلالۃ .... ۱ جلد

شرح حدیث النزول .... ۱ جلد

تفسیر سورہ اخلاص .... ۱ جلد

اصحابِ صفّہ .... ۱ جلد

ردمنطق .... ۱ جلد

کتاب الایمان.. ۱ جلد

یہ تمام کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان میں سے بعض کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں اور ہو تے جارہے ہیں۔ بحمد للہ یہ مطبوعہ ذخیرہ میرے پاس موجود ہے۔

خالد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

وجہ تالیف

اے خدا تو آسان کر اور اپنی رحمت سے میری مدد کر

حمد و نعت کے بعد

میرے بعض احباب نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں ایک ایسا رسالہ لکھوں کہ جس کی وجہ سے قرآن کریم کے سمجھنے میں آسانی ہو اور تفاسیر میں جو رطب و یابس روایتیں ہیں ان کے امتیاز میں آسانی ہو سکے اور ایسی حدِ فاصل معلوم ہو جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحیح روایتوں سے قرآن مجید کے کیا اصول ہیں کیونکہ صحیح علم وہی ہے جو حضور علیہ السلام سے صحیح طریقہ سے ثابت ہو یا ایسے اقوال ہوں کہ جن کی دلیل واضح ہو اور ان کے سوا جو کچھ ہے، ناقابل قبول ہے۔

امت محمدیہ کو قرآن کریم کے سمجھنے کی حقیقی ضرورت ہے۔ اس کے عجائب و غرائب کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ علماءِ حق ہمیشہ قرآن کے تشنہ رہتے ہیں۔ جو شخص کتاب اللہ کی دلیل پیش کرے گا وہی قابلِ قبول ہوگی۔ جو اس پر عمل کرے گا اجر حاصل کرے گا، جو اس کے مطابق حکم دے گا، انصاف کرے گا، جو اس کی جانب مائل ہوگا، ہدایت پائے گا۔ اسی طرح جو اس کو چھوڑ دے گا،

تباہ ہو جائے گا۔ اور جو اس کے ہوتے ہوئے کسی اور چیز کو شمعِ ہدایت بنائے گا، گمراہ ہو جائے گا۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے۔

(۱) فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى. وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى. قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِىْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا. قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى.

"جب میری جانب سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو میری ہدایت پر عمل کرے گا وہ نہ تو گمراہ ہوگا اور نہ بدبخت ہوگا۔ اور ہر وہ شخص جو اس ہدایت اور میرے ذکر سے منہ پھیرے گا اس کی معیشت بھی تنگ ہو جائے گی اور قیامت کے دن وہ اندھا اٹھایا جائے گا۔ اس وقت وہ کہے گا کہ اے خدا میری تو دنیا میں آنکھیں تھیں اور یہاں تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا۔ (خدا جواب دے گا) یہ اس لیے کہ جب میری ہدایت کی نشانیاں تیرے پاس آئیں تو تُو نے ان کو فراموش کر دیا۔ اس لیے آج تو بھی بھلا دیا گیا ہے"۔

(۲) قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ. يَّهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ.

"بے شک تمہارے پاس خدا کی جانب سے نور اور واضح کتاب آئی ہے۔ خدا اس کے ذریعہ سے تم کو ہدایت دیتا ہے۔ جو شخص اس کے مرضیات کی پیروی کرے، اور اسلام کے راستے پر چلے تو خدا کے حکم سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف پہنچایا جاتا ہے اور سیدھے راستہ کی طرف ہدایت پاتا ہے"۔

(۳) الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ. اللّٰهِ الَّذِىْ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا

فِی الْاَرْضِ.

(الـر) یہ وہ کتاب ہے جس کو ہم نے تجھ پر نازل کیا تا کہ تو خدا کے حکم سے لوگوں کو تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے۔ اس خدائے بزرگ و برتر کے (رضا) راستہ پر کہ جو زمین و آسمان میں ہے، اس کی تعریف کرتے ہیں۔

(۴) وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَاالْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّکَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ. صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ. اَلَآ اِلَی اللّٰهِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُo

"اسی طرح ہمارے حکم سے روح کو بھیجا اور تجھ پر وحی کی تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب و ایمان کیا ہے، لیکن ہم نے اس کو نور بنایا۔ ہدایت کرتے ہیں جس کو چاہیں اپنے بندوں میں سے۔ بے شک تو سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ یہ راستہ اس خدائے (بزرگ و برتر) کا ہے کہ اس آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور تمام امور اسی کی جانب پھرتے ہیں۔"

اس لیے میں نے یہ مختصر رسالہ اپنے دوست کی منشاء کے مطابق خدا کے اس کرم سے جو میرے قرینِ حال تھا، مرتب کر دیا اور خدا ہی رشد و ہدایت کی ہدایت فرمانے والا ہے۔

فصل اول

یہ جاننا ضروری ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرامؓ کے سامنے جس طرح قرآن کے الفاظ بیان فرمایا کرتے تھے۔ اسی طرح قرآن کے معنی بھی بیان فرمایا کرتے تھے۔ جس طرح کہ قرآن مجید کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ لِتُبَیِّنَ النَّاسَ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ. ''تاکہ جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے، اس کو تم خوب اچھی طرح بیان کردو۔'' ابوعبدالرحمٰن سلمی کہتے ہیں کہ ہم کو جو لوگ قرآن سکھایا کرتے تھے جیسے حضرت عثمانؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے علاوہ بھی اور لوگ یہ بیان کرتے تھے کہ ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جب دس آیتیں سیکھتے تھے تو اس کے معانی اور مفہوم کو بھی سمجھ لیتے تھے۔ جب تک ایسا نہیں کر لیتے تھے، آگے نہیں بڑھتے تھے۔ یہ صحابۂ کرامؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے قرآن کو اور علم وعمل کو ساتھ ساتھ سیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو ایک ایک سورت سمجھنے اور یاد کرنے میں ایک عرصہ صرف کرنا پڑتا تھا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص ہم میں سے سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران یاد کرلیا کرتا تھا تو وہ ہم لوگوں کی نظروں میں قابلِ عزت ہوتا تھا۔ حضرت عبداللہ ابن عمر نے سورۃ بقرہ کئی سال میں یاد کی اور بروایت امام مالکؒ آٹھ سال صرف کیے۔ یہ اہتمام اس بنا پر تھا کہ خدا فرماتا ہے:

کِتَابٌ اَنْزَلْنَاہُ اِلَیْکَ مُبَارَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْا اٰیٰتِہٖ

''ہم نے تم پر جو برکت والی کتاب اتاری ہے تاکہ اس کی آیات میں غور وتدبر کرو۔''

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰن. ''کیوں قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔''

اَفَلَمْ یَدَّبَّرُوْنَ الْقَول. ''کیا اس کلام میں غور نہیں کیا۔''

کسی کلام میں غور وتدبر وفکر کبھی نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ اس کے معانی کو نہ سمجھ لیا جائے اور اسی طرح خدا کا یہ ارشاد بھی ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔

"تحقیق ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں اُتارا ہے تا کہ تم عقل سے کام لو۔"

عقل سے اسی وقت کام لیا جانا ممکن ہے جب کہ وہ سمجھا بھی جائے۔ اور یہ تو مسلمہ ہے کہ ہر کلام کا منشا و مقصد ہوا کرتا ہے اور یہ مقصد ان کے معانی سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے قرآن کریم سب سے زیادہ اس کا مستحق ہے کہ انسان اس کے معانی و مفہوم کو سمجھے اور پھر ان پر غور و فکر کرے۔ علیٰ ہذا۔

کوئی قوم کوئی بھی کتاب کسی علم و فن کی پڑھے جیسے علم حساب یا علم طب اور پھر اس کے شرح و معانی سے ناواقف بن کر اس کے مقصد کو سمجھ سکے تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کلامِ ربانی بغیر تشریح کے کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔ حالانکہ اسی قرآن کے ذریعہ سے سب کے دین و دنیا کا فائدہ ہے اور تمام برائیوں و گمراہیوں سے ہماری حفاظت کا ذریعہ ہے اور اسی پر ہماری نجات و سعادت کا مدار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ میں تفسیر کے متعلق بہت کم اختلاف ہے۔ تابعین میں بمقابلہ صحابہ کے اختلاف زائد ہے لیکن ان کے بعد کے دور سے پھر بھی ان میں اختلاف کم ہے۔ جس قدر زمانہ حضور انور سے قریب ہے اسی قدر معرفتِ کلامِ ربانی کا علم اور اتحاد زیادہ نظر آتا ہے اور جیسے جیسے زمانہ دور ہوتا جاتا ہے اسی نسبت سے کمی ہوتی جاتی ہے۔ تابعین نے صحابہؓ ہی سے تفسیر کو حاصل کیا۔ حضرت مجاہد تابعی فرماتے ہیں کہ میں نے قرآن کریم حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو سنایا، ہر ہر آیت پر ٹھہرا اور اس کی بابت سوال کیا۔ سفیان ثوری کہتے ہیں کہ جب تم کو مجاہد کے ذریعہ تفسیر معلوم ہو تو اس پر اعتماد کرنا، وہ تمہارے لیے کافی ہے۔ امام شافعی اور امام بخاری نے مجاہد کے واسطے سے جو تفسیر مروی ہے، اس پر اعتماد کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل نے بھی بمقابلہ دیگر علماء کے مجاہد ہی کی تفسیر کو قبول کیا ہے۔ ہمارا مقصد اس بیان سے یہ ہے کہ جس طرح علمِ حدیث تابعین صحابہؓ سے سیکھتے تھے اور ان کی بابت استنباط و استدلال کرتے تھے بالکل اسی طرح تفاسیر کے متعلق بھی ان کا رویہ تھا۔

نوٹ: مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجاہد بن جبیر کا مختصر تذکرہ پیش کر دیا جائے۔ مجاہد نام۔ ابو الحجاج کنیت۔ قیس بن مخزومی کے غلام تھے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ ان کی جلالتِ شان اور امامت پر سب کا اتفاق ہے۔ تفسیر انہوں نے حضرت عبداللہ ابن عباس سے حاصل کی

(بقیہ نوٹ)

اور پورے تیس مرتبہ ان سے قرآن کا دور کیا اور تحقیق کے ساتھ ہر ایک سورۃ پر رک رک کر اس کا شانِ نزول دریافت کیا۔ اکابر صحابہؓ میں انہوں نے حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور حضرت عبداللہ ابن زبیر سے فیض حاصل کیا۔ مکہ کی جماعتِ افتاء کے ایک معزز رکن تھے۔ دنیا اور اہلِ دنیا سے بیگانہ رہتے تھے۔ اعمش کا بیان ہے کہ مجاہد کو جب ہم دیکھتے، مغموم پاتے۔ کسی نے ان سے سبب پوچھا تو فرمایا کہ عبداللہ ابن عباسؓ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ "اے عبداللہ دنیا میں اس طرح رہو کہ معلوم ہو کہ مسافر ہو یا راہ رو ہو۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ جیسے بزرگ صحابی ان کی سواری کی رکاب تھام لیتے تھے۔ ۱۰۲ یا ۱۰۳ ہجری میں سجدہ کی حالت میں انتقال کیا۔

فصل دوم

سلف میں بمقابلہ احکام کے تفسیر میں بہت کم اختلاف ہے اور بظاہر جو اختلاف نظر آتا ہے وہ ایک دوسرے کے مخالف و متضاد نہیں ہے۔ بلکہ تنوعِ لفظی ہے جس کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایک مفسّر نے اپنے الفاظ میں اس کو بیان کیا اور دوسرے نے اپنے الفاظ میں۔ مفہوم ایک ہی رہا۔ جیسے تلوار کو عربی میں سیف بھی کہتے ہیں۔ صارم بھی مُہنّد بھی۔ کسی نے اپنی تفسیر میں سیف کسی نے صارم لکھ دیا تو یہ اختلاف نہیں ہے۔

اسی طرح خدا کے نام حضور ﷺ کے نام یا قرآن کے نام۔ اس لحاظ سے کسی ایک نام سے بھی پکارا جائے گا تو مسمّٰی ایک ہی رہے گا۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى

"کہہ دو خواہ اللہ کا نام لے کر پکارو یا رحمٰن کا نام لو یا اور کوئی نام لو تمام اچھے نام اسی کے ہیں"۔

اس لیے تمام نام مسمّٰی کی ذات کو بتاتے ہیں اور صفت اس میں ظاہر کی جاتی ہے اسی جانب ذہن کو منتقل کرنا بھی مقصود ہوتا ہے۔ جیسے علیم خدا کی صفتِ علم کو نمایاں کرتا ہے۔ قدیر اس کی قدرت کی جانب اشارہ ہے۔ رحیم اس کی ذاتِ رحمت کی جانب اشارہ ہے۔ جو لوگ اسمائے وصف سے ذاتِ باری مراد نہیں لیتے اور انکار کرتے ہیں وہ حد سے زائد تجاوز کیے ہوئے اور غالی فرقہ باطنیہ اور قرامطہ کی طرح ہیں جو کہتے ہیں کہ خدا بغیر حیات کے زندہ ہے۔ اس طرح کے اسماء میں وہ نفی کر دیا کرتے ہیں۔ وہ اصل ذات سے نفی نہیں کرتے بلکہ اس صفت کی نفی کرتے ہیں جس صفت کی وہ وصف وضاحت چاہتا ہے۔ اس لیے جو لوگ ان کی موافقت کریں وہ اتباعِ حضورِ انور سے تجاوز کرتے ہیں۔ یہ موقع اس کی تفصیل کا نہیں ہے۔ اصل مقصود یہ ہے کہ خدا کے تمام ناموں کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو خدا کی ذات اور ایک وہ صفت جو اس نام سے ظاہر ہو۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے نام مثلاً محمد، احمد، ماحی، حاشر اور عاقب ہیں اور اسی طرح قرآن کے نام مثلاً قرآن، فرقان، الہدیٰ، الشفا، البیان، الکتاب اور اسی طرح بہت سی مثالیں ہوسکتی ہیں۔ اس لیے خواہ کوئی بھی نام استعمال کیا جائے، اس میں اصل ذات کو سمجھنا چاہیے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ ۔ یعنی جس نے میرے ذکر سے اعراض کیا۔ سوال یہ ہے کہ ذکر سے یہاں کیا مراد ہے۔ قرآن شریف یا جو کچھ قرآن میں اتارا گیا ہے۔ کیونکہ ذکر مصدر ہے اور مصدر کبھی فاعل کی طرف اور کبھی مفعول کی طرف مضاف کیا جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ کا ذکر مراد ہے۔ مثلاً کوئی کہے۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ یا کلام الٰہی مراد ہے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ آیت متذکرہ سے قبل یہ آیات

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰى۔

”پھر جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ بد بخت۔“

اور ہدایت وہی ہے جو ذکر میں نازل کی گئی ہے اور آیت ماسبق کے بعد پھر یہ آیت:

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْۤ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِیْرًا ۔ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا

”وہ کہے گا اے پروردگار میں تو دنیا میں بینا تھا۔ مجھے اندھا کیوں اٹھایا۔ جواب میں کہا جب میری نشانیاں تیرے پاس آئیں تو ان کو بھول گیا۔ اسی طرح آج تو بھی بھلا دیا جائے گا۔“

اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ ذکر وہی کلام ہوگا جو نازل کیا گیا ہے یا جو شخص خدا کا ذکر کرتا ہے۔ اگر ذکر سے مراد کتاب، کلام یا ہدایت۔ لیے جائیں تو ہماری رائے میں مفہوم ایک ہی ہوگا۔ چونکہ دریافت کرنے والے کا منشاء اس ذات کا سمجھنا ہے خواہ اس نام کے صفات کتنے ہی بیان کئے جائیں۔ بعینہٖ اس طرح کہ جب خدا کے ان صفت یعنی قدوس، سلام، مومن، مہیمن وغیرہ بیان کئے جائیں تو گو وہ صفاتِ باری ہیں لیکن مقصد ذاتِ باری تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ اس

وضاحت کے بعد یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سلف کا طریقۂ کار یہی تھا کہ وہ ایسے مختلف الفاظ وصفات استعمال کیا کرتے تھے خواہ اس محل پر اسمِ ذات کی ضرورت ہی کیوں نہ ہو۔ ان کے طرزِ ادا میں جس طرح احمد ہے اسی طرح حاشر، ماحی اور عاقب ہے۔ اسی طرح قدوس، غفور، رحیم اور اللہ ہے گویا مسمّیٰ ذاتِ واحد ہے اور صفات مختلف۔ اس اظہارِ حقیقت کے بعد یہ بات خود بخود ثابت ہوجاتی ہے کہ یہ صورتیں اختلاف کی نہیں ہیں۔ ایک مزید مثال یہ ہے کہ الفاظ صراطِ مستقیم میں بعض کے خیال میں وہ قرآن حکیم ہے اور ان کی دلیل رسول اللہؐ کا یہ ارشاد ہے کہ قرآن اللہ کی مضبوط رسی بھی ہے، ذکرِ حکیم بھی ہے اور صراطِ مستقیم بھی۔ یہ روایت ترمذی نے بواسطہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور ابونعیم نے متعدد طریقوں سے روایت کیا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک صراطِ مستقیم کا مفہوم اسلام ہے اور یہ اس وجہ سے کہ ترمذی نے نواس بن سمعانؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراطِ مستقیم کی وضاحت میں یہ مثال بیان فرمائی کہ ایک سیدھا راستہ ہے اور اس راستہ کے دونوں طرف دیواریں ہیں۔ ان دیواروں میں دروازے کھلے ہوئے ہیں لیکن ان پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک پکارنے والا راستے کے اوپر سے پکار رہا ہے اور ایک پکارنے والا اس راستے کے سرے سے بلا رہا ہے۔ پھر فرمایا: یہ راستہ تو اسلام ہے۔ اور وہ دیواریں اللہ کی حدود ہیں اور جو دروازے ہیں وہ اللہ کے محارم ہیں اور اس راستے کے سرے پر بلانے والا اللہ کی کتاب ہے۔ اور راستے کے اوپر سے بلانے والا مسلمان کا دل ہے، جس کو ضمیر کہتے ہیں۔

اس روایت سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دونوں ارشادات ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں۔ اسلام کیا ہے۔ قرآن کے اتباع کا نام ہے۔ الفاظ مختلف ہیں مگر معنی اور مفہوم ایک ہی ہے۔ بعض حضرات کا یہ بھی قول ہے کہ صراطِ مستقیم سے اہلِ سنت والجماعت کا طریقہ مراد ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ طریقۂ عبودیت مراد ہے۔ کسی کی رائے ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت مراد ہے۔ بہر نوع الفاظ وتاویلات مختلف ہیں لیکن مقصد ایک ہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایک عام لفظ کسی نوع یا قسم کے متعلق استعمال کیا جائے جس سے مقصد صرف تمثیل ہے۔ ایسے الفاظ کے استعمال سے غرض یہ ہوتی ہے کہ سننے والے کو بلحاظ تمثیل

کے سمجھا دیا جائے کہ اصل چیز ایسی ہے مثلاً ایک عجمی شخص عربی کے لفظ (خبز) تنوری روٹی کو دریافت کرے تو جواب دینے والا ایک چپاتی دکھا کر یہ بتلا دے گا کہ اس قسم کی چیزوں کو (خبز) کہا جاسکتا ہے اور جس کی واضح مثال قرآنِ مجید میں ہے:

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرَاتِ۔

"پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے جن کو منتخب کیا ان کو کتاب کا وارث بنایا۔ بعض ان میں سے اپنے نفس پر ظالم تھے بعض میانہ رو تھے اور بعض بھلائی کے کاموں میں سبقت کرنے والے تھے۔"

ظالم لنفسہ کا لفظ ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے، جب کوئی شخص واجباتِ شرعی کو ترک کرے اور محرمات کا ارتکاب کرے۔ اسی طرح مقتصد کا لفظ وہاں استعمال ہوتا ہے جب محرمات سے بچے اور واجباتِ شرعی پر عمل کرے اور سابق کا لفظ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب واجباتِ شرعی پر کامل عمل کرتے ہوئے نیکیاں اس درجہ غالب ہو جائیں کہ برائی کا احتمال نہ رہے۔

اس وضاحت کی غرض یہ ہے کہ قرآن میں مقتصد کا لفظ اصحابِ یمین پر بھی استعمال ہوا ہے۔ اور سابقون کا لفظ مقربون کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ان تینوں الفاظ کی تعبیر جگہ جگہ علماء نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے فرمائی ہے۔ مثلاً سابقون وہ ہیں جو اول وقت نماز پڑھتے ہیں اور مقتصد وہ ہیں جو درمیانی وقت میں پڑھتے ہیں اور ظالم وہ ہیں جو عصر کی نماز کو اس قدر تاخیر سے پڑھتے ہیں کہ دھوپ میں زردی آجاتی ہے۔ سورۂ بقرہ میں ایک موقع پر ان تینوں الفاظ کی تعبیریوں ہے۔ محسن یعنی سابق بالخیرات وہ ہیں جو صدقہ دیتے ہیں۔ ظالم وہ ہیں جو سود کھاتے ہیں۔ عادل (مقتصد) وہ ہیں جو کاروبارِ تجارت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دولت مند طبقہ کے لحاظ سے اس طبقہ کو انہی تین درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یا تو وہ محسن ہوں گے یا عادل یا ظالم۔ محسن وہ ہیں جو زکوٰۃ مفروضہ کے علاوہ دیگر صدقات و خیرات و قومی امداد کرتے رہتے ہیں۔ عادل یا مقتصد وہ ہیں جو سود نہیں کھاتے اور زکوٰۃ مفروضہ ادا کرتے ہیں اور ظالم وہ ہیں جو سود کھاتے ہیں اور زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔ اس تشریح سے غرض یہ ہے کہ یہ الفاظ اس درجہ

جامع و حاوی ہیں کہ مذہبی، اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے جماعتی زندگی کی تقسیم انہیں کے ذیل میں کی جاسکتی ہے۔

ایسی متعدد مثالیں ہیں جن سے ہر شخص کو مطمئن کیا جا سکتا ہے اور عقلِ سلیم ان وضاحتوں کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہے۔ چنانچہ ایسی آیتوں کی تفسیر اسی نوعیت سے کی گئی ہے جیسے کہ آیتِ ظہار ثابت ابن قیس بن شماس کی بیوی کے بارے میں نازل ہوئی، اور آیتِ لعان عویمر العجلانی یا ہلال بن امیہ کے بارہ میں نازل ہوئی۔[1]

اور آیت کلالہ حضرت جابر بن عبداللہؓ کے بارے میں نازل ہوئی اور یہ آیت (وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ) یہ یہود بنی قریظہ و بنونضیر کے بارے میں نازل ہوئی اور آیت (وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗ) بدر کے واقعہ کے متعلق ہے اور آیت (شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ) یہ تمیم داری اور عدی بن زید کے قصہ میں نازل ہوئی اور قول ابو ایوب انصاریؓ کا (وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ) یہ ہم انصاریوں کے متعلق نازل

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۹۵ میں روایت موجود ہے کہ ایک شخص شریک بن سحماء تھا۔ ہلال بن امیہ کو اپنی بیوی کی نسبت اس کی طرف سے شبہ ہوا۔ ہلال نے بارگاہِ نبوت میں عرض کیا کہ یہ حاملہ ہے۔ ارشاد ہوا کہ دو صورتیں ہیں۔ یا تو ثبوت پیش کرو یا اپنے پیٹھ پر دُرّے کھاؤ۔ ہلال نے عرض کیا کیا ہی عجیب بات ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کو دوسرے کے پاس دیکھے بھی اور خود ہی ثبوت بھی فراہم کرے۔ حضور ﷺ نے پھر وہی ارشاد فرمایا۔ ہلال نے عرض کیا: اس ذات کی قسم جس نے حق و صداقت کے ساتھ آپ کو مبعوث کیا، میں بالکل سچا ہوں اور مجھے امید ہے کہ خدا ایسی آیتیں نازل فرمائے گا جس سے میری پیٹھ حد سے بچ جائے گی۔ اس کے بعد آیتِ لعان نازل ہوئی وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ آخر آیت۔
حضور ﷺ نے ہلال کو بلا کر (اَشْهَدُ) کے لفظ سے دعویٰ سنا اور فرمایا کہ تم دونوں میں ایک یقینی جھوٹا ہے۔ لیکن توبہ بہرحال بہتر ہے۔ دیکھیں اس کی بھی کسی کو توفیق ہوتی ہے۔ ہلال کے بعد اس کی بیوی کھڑی ہوئی اور ہلال کے الفاظ کی طرح اس نے بھی اپنی برأت کا اظہار کیا۔ پانچویں مرتبہ اس کو لوگوں نے روکا اور وہ یہ کہتی ہوئی واپس ہوئی کہ میں اپنی قوم کو کبھی رسوا نہیں کر سکتی۔ ارشاد ہوا کہ دیکھنا کہ اگر سرگیں چشم پرگوشت سرین اور موٹی پنڈلیوں والا لڑکا پیدا ہوا تو شریک کا سمجھا جائے گا۔ چنانچہ شریک کا ہی ہم شبیہ لڑکا پیدا ہوا۔ حضور ﷺ کو معلوم ہوا تو فرمایا کیا کہوں؟ کتابِ الٰہی کا معاملہ ہے، ورنہ آج اسے بتلا دیتا۔ (خالد)

ہوئی ہے۔[1]

ایسے نظائر بکثرت ہیں کہ مفسرین کہہ دیا کرتے ہیں کہ فلاں آیت مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی یا اہلِ کتاب میں سے یہود و نصاریٰ کے متعلق یا مسلمانوں کے کسی طبقہ کے متعلق۔ اس لیے یہ محفوظ رکھنا چاہیے کہ ان حضرات کی اس وضاحت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آیت کا حکم صرف اسی طبقہ سے متعلق ہے کیونکہ ایسا کوئی عقلمند مسلمان نہیں کہہ سکتا۔ اگر یہ الجھن ہو کہ یہ لفظ عام ہے اور مخصوص اس بات کے لیے نازل ہوا ہے تو یہ واقعہ ہے کہ علماءِ اسلام میں سے کوئی شخص اس کا قائل نہیں ہے کہ قرآن و حدیث کے احکام عام کسی شخصِ معیّن کے لیے مخصوص ہیں البتہ یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ یہ احکام اس شخصِ خاص یا اس جیسے اشخاص پر حاوی کئے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح کوئی آیت ہو امر کی یا نہی کی یا حسن و قبح کی تو اس کی حیثیت بھی ویسی ہی رہے گی جیسا کہ بیان کیا گیا۔

اس اصول کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ سبب کا علم مسبب تک پہنچا دیتا ہے۔ اس بناء پر فقہاء کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ جب قسم کھانے والے کی نیت کا حال معلوم نہ ہو سکے تو قسم کھانے کے اسباب پر غور کیا جائے گا۔ اسی طرح کوئی آیت کبھی تو اس کے سببِ نزول کی طرف بیان کی جاتی ہے اور کبھی خود اس آیت ہی میں سبب پیشِ نظر ہوتا ہے۔ علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ سبب شانِ نزول آیت کو مسند میں شامل کیا جائے یا نہیں۔ امام بخاری اس کو مسند میں داخل فرماتے ہیں اور بہت سے لوگ اس کو مسند میں داخل نہیں کرتے اور اکثر مسانید اسی اصطلاح پر

---

[1] ابو عمران نے روایت کیا ہے کہ مہاجرین میں سے ایک شخص نے جبکہ قسطنطنیہ پر حملہ کیا تو دشمنوں کی صف چیر کر ان کی فوج میں گھس گیا۔ لوگوں نے کہا کہ اس شخص نے اپنے آپ کو خود ہلاکت میں ڈالا ہے اور آیت (وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ پڑھا۔) حضرت ابوایوب انصاریؓ نے فرمایا کہ یہ آیت ہم انصاریوں کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ ہم حضور علیہ السلام کے ساتھ رہے اور لڑے۔ جب اسلام سب جگہ چھا گیا تو ہم انصاریوں نے جمع ہو کر یہ مشورہ کیا کہ اب تو لڑائی بند ہو چکی، لہٰذا اب اپنے ذاتی کاروبار اور اہل و عیال کے لیے کچھ کرنا چاہیے تو (انفاق فی سبیل اللہ) کے بجائے ہمارے ان خیالات کی اصلاح کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ روایت مستدرک، حاکم، ترمذی وغیرہ میں بسندِ صحیح مروی ہے۔ اسی کے قریب قریب ضحاک جو مشہور مفسر ہیں، ان کا قول یہ ہے کہ انصار خیرات و صدقات زیادہ کیا کرتے تھے ایک سال قحط پڑا انہوں نے اپنا ہاتھ روک لیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (خالد)

مرتب ہوئی ہیں جیسے کہ مسند امام احمد وغیرہ کیونکہ سببِ شانِ نزول میں بعض بعض اختلاف مروی ہوئے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس میں بیشتر مخالفت تو نہیں ہے بلکہ طریقۂ بیان کا اختلاف ہے، جیسا کہ پہلے ہم واضح کر چکے ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی سبب کی وجہ سے اور دوسری مرتبہ کسی اور وجہ سے آیت کا نزول ہوا ہو یا یہ کہ وہ آیت دو مرتبہ نازل ہوئی ہو کبھی اس سبب سے اور کبھی اُس سبب سے۔ اور یہی دونوں حیثیتیں ہیں جن کا ہم نے تذکرہ کیا ہے۔ پس ایسا اختلاف بھی زیادہ تر اسماءِ صفات کے مختلف معنوں کے سبب سے پیدا ہوا ہے۔ جیسے لفظ قَسْـــوَرَۃٌ، شیر کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے اور تیر انداز کے بھی۔ اور لفظ عسعس جورات کے آنے اور رات کے جانے دونوں معنوں میں مستعمل ہے۔ اس لیے ایسے مواقع پر علماءِ سلف کی تفاسیر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض صورتیں ضمائر کی وضاحت میں بھی اختلاف کا سبب بن جاتی ہیں کہ جن شخصیتوں کا ذکر ہو چکا ہے، ان میں سے کون سی شخصیت مراد ہے۔ اس کی مثال یہ ہے (ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی. فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی) اس کی ضمیروں میں اختلاف ہے۔ یا (وَالْـفَـجْرِ وَ لَيَالٍ عَشْرٍوَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ وَاللَّيْلِ) اس جیسی آیتیں ان کے معنی جو سلف نے لیے ہیں، وہ ٹھیک ہیں۔ باقی ان کے علاوہ مناسب نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کبھی ایک آیت دو مرتبہ نازل ہوئی ہو پہلی بار ایک مقصد مراد لیا گیا، دوسری بار دوسرا۔ لیکن لفظ کے اگر دو مشترک معنی ہیں جیسا کہ قسورہ اور عسعس میں بیان کیا گیا تو علماءِ مالکیہ، شافعیہ، حنبلیہ اور اکثر اہلِ کلام کا یہ مذہب ہے کہ دونوں معنی لینا جائز ہیں اور اگر ایسا عام لفظ ہے جس کے معنی مشہور ہیں تو وہی مشہور معنی مراد لیے جائیں گے جب تک کہ کوئی وجہ تخصیص نہ ہو۔

بعض صورتیں ایسی بھی پیش آتی ہیں، جب قریب المعنی الفاظ میں تفسیر کی گئی ہو۔ کبھی مترادف یعنی ہم معنی الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کو بھی بعض مفسرین نے اختلاف سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ مترادف الفاظ بہت کم ہیں۔ قرآن مجید میں یا تو نادر ہیں ورنہ بالکل نہیں ہیں۔ البتہ قریب المعنی الفاظ ہیں اور یہ بھی قران کا اعجاز ہے مثلاً یہ آیت يَـوْمَ تَـمُـوْرُا السَّـمَـآءُ مَـوْرًا میں مور کے معنی حرکت کے ہیں اور یہ لفظ خفیف وسریع حرکت کو بتاتا ہے۔ اسی طرح وحی کے معنی اعلام کے ہیں یعنی ظاہر کرنا یا اشارہ کرنا۔ یا اَوْحَيْـنَـآ اِلَيْـكَ اَنْـزَلْنَـآ اِلَيْـكَ اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ ہم نے تجھ پر اس بات کو نازل کیا یا ظاہر کیا یا

یوں فرمایا گیا وَقَضَیْنَآ اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ یعنی بنی اسرائیل کو آگاہ کر دیا گیا تھا۔

ایسی کئی مثالیں ہیں جہاں مترادف نہیں بلکہ قریب المعنی الفاظ مستعمل ہیں چونکہ وحی کے لفظی معنی کسی چیز کو مخفی طریقہ پر جلد ظاہر کرنا ہے اور قَضَیْنَا کے معنی مخصوص طور پر ان کو جتلا دینا یا ظاہر کر دینا ہے اور عرب کا یہ قاعدہ ہے کہ فعل لازم کی جگہ معنی میں فعل لازم اور متعدی کی جگہ متعدی معنی میں بولتے ہیں اور یہ غلط ہے کہ کوئی حرف کسی دوسرے حرف کا قائم مقام بنایا جائے جس طرح لَقَدْ ظَلَمَکَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِکَ اِلٰی نِعَاجِهٖ یامَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ یعنی اللہ کے ساتھ، اور اس قسم کی متعدد آیتیں ہیں۔ اس میں قولِ محقق بصرہ کے نحویوں کا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ ایک نعجہ کو بھی یعنی ایک دنبی کو اور دنبیوں میں شامل کرنا مقصود ہے[1]

اس طرح اس آیت کے معنی یہ ہوں گے۔

وَاِنْ کَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَکَ عَنِ الَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ

تجھے کج روی پر آمادہ کریں یا تجھے سیدھے راستے سے روک دیں۔

اسی طرح اس آیت میں وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۝ نصرنا کے معنی ہم نے نجات دی اور ان کو علیحدہ کر دیا۔ یا

یَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ کے معنی اچھی طرح اللہ کے بندے سیراب ہوں گے۔

ایسی مثالیں بکثرت ہیں اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ لاریب اور لاشک مترادف ہیں، یہ بات نہیں ہے بلکہ ریب کے معنی پریشانی، اضطراب اور حرکت کے ہیں چنانچہ ایک حدیث میں ہے دَعْ مَا یُرِیْبُکَ اِلٰی مَا لَا یُرِیْبُکَ اور ایک حدیث میں ہے کہ اگر کسی ہرن کے پاس سے گزرو تو اس کے پاس جا کر اس کو پریشان نہ کرو (لَایُرِیْبُہٗٓ اِلَّا) یہاں بھی لفظ "ریب" ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یقین کا خاصہ سکون وطمانیت قلب ہے اور "ریب" اس کی ضد ہے۔

---

[1] (سورۃ ص رکوع اوّل) حرف لام لقد میں توطیۂ قسم کا ہے، اور یہ مع اپنے مابعد کے قسم مقدر کا جواب ہے۔ (حضرت داؤد علیہ السلام نے) کہا کہ وہ تجھ پر ظلم کرتا ہے کہ اپنی دنبیوں میں تیری دنبی ملانے کا سوال کرتا ہے۔ نعجہ بھیڑ کو کہتے ہیں اور کبھی وحشی گائے پر یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اور کنایۃً عورت کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسے یہاں ہوا ہے۔ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ یعنی اللہ کے راستہ میں کون میرے مددگار ہیں۔ (خالد)

اس لیے اضطراب، پریشانی، تذبذب، خاصۂ ''ریب'' ہے لیکن اگر ریب کی جگہ لفظ شک استعمال کیا جائے تو اس سے وہ مفہوم ادا نہیں ہوتا بلکہ اس کو قریب المعنیٰ لفظ کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ میں ذلک کا مشارٌ الیہ قرآن ہے مگر لفظ کتاب کے مفہوم میں ساری عبارت شامل ہے جو اس کتاب یعنی قرآن میں ہے۔ محض لفظ قرآن مراد نہیں ہے۔ اس قسم کا لفظی فرق بھی قرآن کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے، یا اگر کوئی کہے۔ ''اِنْ تُبْسَلَ'' جس کے معنی ہیں، روکا گیا یا قید کیا گیا اور بعض لوگوں نے اس کے معنی ''رہن کیا گیا ہے'' لیے ہیں، تو یہ تضاد نہیں ہے۔ چونکہ مقید اور مرتہن اگرچہ مترادف نہیں ہیں تاہم قریب المعنیٰ ہیں۔ اس لیے سلف کی تفسیر میں اسی قسم کا اختلاف نظر آتا ہے تاہم ان کی عبارات سے مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے اور اس قسم کا اختلاف بظاہر احکام میں بھی نظر آتا ہے جس سے عوام الجھن میں پڑ جاتے ہیں لیکن عام اور مشہور احکام میں کوئی فرق نہیں ہے۔

جیسے پانچ وقت کی نماز، نماز کی تعدادِ رکعات، نماز کے ارکان، مسائلِ زکوٰۃ، اس کا نصاب وغیرہ، رمضان المبارک کے روزے، طواف، قیامِ مزدلفہ، عرفات، رمی جمار اور حج کے مسائل۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور سلف سے خلف تک متواتر ان پر عمل ہو رہا ہے۔ البتہ صحابۂ کرام میں دادا اور حقیقی بھائیوں وغیرہ کے تقسیمِ میراث میں اختلاف ہے، لیکن ان مسائل میں مطلق شک و شبہ کی گنجائش نہیں عموماً فرائض (تقسیمِ ترکہ) میں جن مسائل کا ذکر ہے، وہ یہ ہیں۔ پہلے تو باپ دادا بیٹے اور پوتے کا سیدھا سلسلہ۔ دوسرے کلالہ یعنی بیٹا، پوتا نہ ہو محض بھائی بہن ہوں اور باپ دادا بھی نہ ہوں۔ تیسرے خاوند اور بیوی کے باہم وراثت کا طریقہ ہے۔ خدا نے تین آیتوں میں احکامِ وراثت بیان فرمائے ہیں۔ پہلی آیت میں تفصیل سے اصول و فروع بیان فرمائے، اور دوسری آیت میں بطور وضاحت زوجہ و زوج کی وراثت کو بیان کیا، اور تیسری آیت میں علّاتی بہن بھائی، اخیافی بہن بھائی اور عصبات کا ذکر فرمایا ہے۔ دادا اور بھائی کی وراثت کا معاملہ حضور علیہ السلام کے عہد مبارک میں پیش نہیں آیا۔ آپ کے بعد یہ صورت پیش آئی، اس لیے خلفاءِ راشدین سے اس میں اختلاف منقول ہے۔ یہ اختلاف اس وجہ سے ہوا کہ

ان حضرات نے حضور علیہ السلام سے اس بارے میں کچھ نہیں سنا اور نصِ قطعی کے سمجھنے میں کچھ فروگذاشت ہوئی۔ اس اختلاف سے کوئی خاص مخالفت نہیں ہے بلکہ فقہی استدلال ہیں۔ یہاں ہمارا مقصد اظہارِ خیال ہے، تفصیلی بحث پیش نظر نہیں ہے۔ [1]

نوٹ متعلقِ وراثت

[1] وراثت کے متعلق قرآن میں یہ حقوق قرار دیے گئے ہیں۔ اول قرابت، جیسے اولاد، ماں باپ، بہن بھائی۔ دوسرے خاوند بیوی۔ تیسری حیثیت "کلالہ" کی ہے۔ اس میں دو گروہ ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ کلالہ وہ ہے جس کا نہ باپ موجود ہو نہ کوئی لڑکا۔ عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ کلالہ وہ ہے جس کا لڑکا موجود نہ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر حضور علیہ السلام ان تینوں کی وضاحت فرما جاتے تو مجھے ساری دنیا سے یہ عمل پسند تھے۔ کلالہ کی وضاحت، خلافت کا مسئلہ، ربا کی توضیح۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں دادا کی وراثت کا مسئلہ پیش آیا یعنی اگر کوئی میت ورثاء میں صرف دادا اور بھائی بہن چھوڑے تو مستحقِ وراثت کون ہوگا۔ دادا یا بھائی بہن۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ان کے ساتھ چودہ صحابہ کی رائے یہ تھی کہ دادا قائم مقام باپ ہے اور بھائی بہن محجوب الارث ہیں لیکن صحابۂ کرام کی بڑی جماعت ان کی رائے کے خلاف تھی۔ وہ جماعت بھائی بہن کو اصل وارث قرار دیتی تھی۔ (خالد)

فصل سوم

علم کا مدار یا تو صحیح روایت پر منحصر ہے یا پھر محققانہ استدلال ہو۔ اس لیے علمِ تفسیر میں جو اختلاف ہے، وہ بھی اسی طرح کا ہے۔

روایت کی بھی دو قسمیں ہیں، یا تو وہ حضور علیہ السلام کی ذاتِ گرامی سے منقول ہوں یا پھر کسی بھی غیر معصوم فرد سے منقول ہوں۔ لیکن حدیث کی صحت و عدم صحت کی کامل شناخت ہونی چاہیے اور اگر کسی غیر معصوم سے کچھ مروی ہے تو اس میں بحث ہی فضول ہے اور ایسی باتوں سے احتراز ہی اولیٰ ہے۔ چونکہ خدا تعالیٰ نے حق کے لیے خود ہی دلیل کو بیان فرمایا ہے، غیر معصوم افراد کے اقوال سے اختلاف ہوا اور ان سے مسلمانوں کو کچھ فائدہ نہیں پہنچا۔ مثلاً اصحابِ کہف کا حال ان کی تعداد سے بحث۔ حضرت موسیٰ نے گائے کو خود ذبح کیا تھا اور کس طرح کس حصہ کو ذبح کیا گیا۔ حضرت نوح کی کشتی کا طول و عرض کیا تھا، اور وہ کس لکڑی کی تھی، اور جس لڑکے کو حضرت خضر نے قتل کیا تھا، اس کا کیا نام تھا۔ ایسی بہت سی باتیں ہیں۔ اگر حضور علیہ السلام سے بسندِ صحیح کسی بات کی تصدیق ہو جائے تو وہ قابلِ تسلیم ہو سکتی ہے۔ جس طرح یہ ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس بزرگ کے پاس بغرضِ تعلیم گئے تھے، وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ یہ روایت چونکہ بسندِ صحیح ثابت ہے، اس لیے قابلِ تسلیم ہے۔ تفاسیر میں بہت سا حصہ اس قسم کے قصوں کا اہلِ کتاب سے بھرا ہوا ہے اور ایسی روایتیں کعب احبار، وہب بن منبہ، محمد ابن اسحاق وغیرہ نے اہل کتاب سے لے کر تفاسیر میں شامل کر دی ہیں۔ ایسی روایتوں کی نہ تصدیق کرنی چاہیے نہ تکذیب۔ چونکہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ اہلِ کتاب تم سے کچھ بیان کریں تو ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب۔ کتبِ تفاسیر کے دیکھنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ بعض تابعین نے اہلِ کتاب کے اقوال کو داخلِ تفسیر کر دیا اور اہلِ کتاب کے نام کا اظہار نہیں کیا۔ اس لیے تابعین کا مجرد قول حجت نہیں ہے۔ بہر نوع سکوت بہتر ہے چونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ روایت اس تابعی نے کسی صحابی سے سنی ہو مگر نام ظاہر نہیں کیا اور صحابی

نے حضورِ انورؐ سے سنا ہو یا اس تابعی نے کسی اور تابعی سے سنا ہو جو بلحاظِ وسعتِ علم اس سے بہتر ہو۔ اس لیے یہ بات بے حد ضروری ہے کہ حدیث کا علم بدرجۂ اتم ہونا لازمی ہے، تاکہ یہ پیچیدگیاں سمجھ میں اچھی طرح آ سکیں۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ علماءِ ربانی کی کاوش و برکت سے ہمارے پاس کافی ذخیرۂ کتبِ حدیث موجود ہے۔ ہم صحیح حدیث کو موضوع سے پرکھنے کے علاوہ اس کے اسباب پر بھی بحمداللہ کافی بصیرت رکھتے ہیں۔ فنِ تفسیر کے سلسلہ میں بھی حضورِ انور علیہ السلام سے بہ کثرت صحیح روایتیں موجود ہیں۔ اسی طرح فنِ سیر میں بھی صحیح حدیثیں ہیں اور بعض علومِ متعارفہ کی طرح ان پر مزید بحث کی بھی اس لیے ضرورت نہیں ہے کہ ان کی صحت پر اجماع ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ خدا نے جن باتوں کو بیان فرمایا ہے اور جن کا تعلق دین سے ہے، ان کے دلائل بھی واضح فرما دیے ہیں۔ ہمیں جہاں تک علم ہے، تفاسیر میں بمقابلہ مغازی و سیر روایتوں کا کافی ذخیرہ ہے اور یہ جو امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ جن کی کوئی سند نہیں ہے۔ تفسیر، ملاحم، مغازی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی سندیں فنِ حدیث کے لحاظ سے قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ ان میں زیادہ تر مرسل روایتیں ہیں جو عروہ بن زبیر، امام شعبی، امام زہری، موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحٰق سے روایتیں کی گئی ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ مغازی کا فن اہلِ مدینہ سب سے زیادہ جانتے تھے۔ ان کے بعد اہلِ شام، ان کے بعد عراق والے ہیں۔ اہلِ مدینہ اس وجہ سے زیادہ واقف ہیں کہ مغازی کے واقعات تقریباً انہیں کو پیش آئے اور شام والوں کو بھی اس سے سابقہ پڑا۔ ابی اسحٰق فرازی کی وہ تصنیف جو سیر و غزوات میں مرتب ہوئی ہے، بہترین کتاب ہے اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس فن میں اپنے معاصرین میں ممتاز تھے۔ رہا فنِ تفسیر تو اس کے جاننے والے اہلِ مکہ اس لیے تھے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگردوں کا مرکز مکہ تھا۔ جیسے مجاہد، عطاء بن ابی رباح و عکرمہ مولیٰ ابن عباس، طاؤس، ابی الشعثاء اور سعید بن جبیر وغیرہ۔ اسی طرح اہلِ کوفہ میں جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگرد ہیں، وہ دیگر علماء کے مقابلہ میں اپنے فن میں امتیاز رکھتے ہیں۔ علماءِ مدینہ میں تفسیر کے جاننے والے زید بن اسلم ہیں جن سے فنِ تفسیر کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اور زید کے لڑکے عبدالرحمٰن اور عبداللہ بن وہب نے حاصل کیا۔

یہ اصول بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ مرسل روایتیں جب مختلف طریقوں سے مروی ہوں اور یہ مختلف طریقے ایک ہی شخص سے مروی نہ ہوں تو ان کی صحت تسلیم کی جائے گی۔ چونکہ مختلف طریقوں سے اور مختلف اشخاص سے ایک ہی واقعہ کا مروی ہونا دلیل و حجت ہے۔

اصول یہ ہے کہ جب کوئی حدیث دو یا دو طریقوں سے زیادہ روایت کی جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ایک دوسرے سے ان روایت کرنے والوں میں کسی نے کسی سے متاثر ہو کر واقعہ بیان نہیں کیا اور ان میں اگر قدرے اختلافِ لفظی بھی ہو تو یہ یقین کر لیا جائے گا کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ مثلاً ایک شخص ایک روایت بیان کرتا ہے اور تفصیلی واقعات کا اظہار کرتا ہے اور دوسرا راوی اس روایت کو بغیر اس شخص کے ملے ہوئے کسی دوسرے راوی سے مع ان تمام تفصیلات کے بیان کرتا ہے تو ہم یقین کر لیں گے کہ یہ واقعات اسی طرح پیش آئے۔ اگر یہ احتمال ہو کہ دونوں نے جھوٹ بولا ہے یا غلطی کی ہے تو عقلِ سلیم اس کو بھی تسلیم نہیں کرتی کہ اس قدر تفصیلی واقعات میں جبکہ دونوں راوی علیحدہ علیحدہ ہیں اور دونوں کے شیوخ بھی علیحدہ علیحدہ ہیں، یہ خیالِ فاسد کیا جائے۔ ایسی صورتوں میں یہ شرط قائم رہے گی کہ شخصِ اوّل نے اس دوسرے شخص سے کچھ علم حاصل نہ کیا ہو۔ اس کی بدیہی مثال یہ بھی ہے کہ ایک شخص نے ایک مصرعہ کہا اور دوسرے شخص نے بھی ویسا ہی مصرعہ کہہ دیا یا ایک شخص نے ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کیا، دوسرے نے بھی بجنسہٖ ویسا ہی واقعہ بیان کر دیا، تو یہ ممکن ہے۔ لیکن اگر کسی شخص نے قصیدہ یا کوئی نظم بحر و قوافی کے لحاظ سے پڑھا اور کسی دوسرے نے بھی بجنسہٖ اسی طرح انہیں الفاظ سے ادا کیا تو سمجھ لیا جائے گا کہ اس شخص نے اس سے سنا ہوگا اور اگر بلحاظِ بحر و قوافی علیحدہ علیحدہ ہوں تو یہ احتمال نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی طویل حدیث جس میں اور علوم و فنون بھی ہوں، بیان کرے اور کوئی دوسرا شخص جس نے اس راوی سے کبھی ملاقات بھی نہ کی ہو، بالکل انہیں الفاظ سے بیان کرے تو عقلِ سلیم تسلیم کرے گی کہ یہ روایت صحیح ہے۔ اس لیے اس اصل پر جو روایتیں مختلف طریقوں سے علماء کو پہنچتی ہیں، وہ قابل قبول ہوتی ہیں۔ اگر حدیث بطور خبرِ آحاد روایت ہو یا وہ روایت ہی مرسل ہو یا کسی راوی کے ضعیف الحافظہ ہونے کی وجہ سے اس روایت میں ضعف ہو لیکن اس قسم کے بہت سے شواہد مل جائیں تو کثرتِ شواہد کی وجہ سے اس روایت پر اعتماد کیا جائے گا۔

جس طرح تواتر سے ثابت ہے کہ جنگِ بدر جنگِ احد سے پہلے ہوئی اور یہ بھی ثابت ہے کہ معرکۂ بدر میں حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ کے مقابلہ میں عتبہ، شیبہ اور ولید تھے، چنانچہ حضرت علیؓ نے اپنے حریف کو اور حضرت حمزہؓ نے اپنے حریف کو قتل کر دیا۔ یہ سوال کہ حضرت حمزہ کا مقابلہ کس سے ہوا۔ بہر حال مقابل کوئی ہو، ان دونوں حضرات کے مقابل قتل ہوئے۔ اس لیے ہمیں یہ اصل یاد رکھنا چاہیے کہ یہ واقعہ ہوا تو اس کو صحیح سمجھنا چاہیے۔ تفسیر، حدیث، مغازی اور سیر میں زیادہ تر اسی قسم کی روایتیں ہیں۔ ان میں سے اگر یہ ثابت ہو جائے کہ رواۃ حدیث وغیرہ کے طریقے جدا جدا ہیں اور مختلف طریقوں سے ایسی روایت حضورِ انورؐ تک مسلسل پہنچ جائے تو ایسی روایتوں پر جھوٹ کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ اگر چہ بعض نیچے کے طبقے کی رواۃ میں سوءِ فہم کی جرح کیوں نہ کی گئی ہو۔ چونکہ صحابہ کرام جیسے عبداللہ بن مسعودؓ ابی بن کعبؓ عبداللہ بن عمرؓ جابر بن عبداللہ، ابوسعید خدری، ابوہریرہ وغیرہم سب عدول تھے، بالکل اسی طرح کہ جیسے کوئی نیک اور متقی شخص کے اندرونی حالات سے باخبر ہونے پر ہم ان پر کوئی تعزیری یا بداخلاقی کے جرم کا تصور نہیں کر سکتے۔ یہی حالت ان تابعین کرام کی ہے جو مکہ، مدینہ، شام، بصرہ وغیرہ میں ممتاز و مشہور ہیں۔ جیسے ابو صالح سمان، اعرج، سلیمان بن یسار، زید بن اسلم یا ان سے بالاتر طبقہ جیسے محمد بن سیرین، قاسم بن محمد، سعید بن مسیب، عبیدہ، علقمہ، اسود وغیرہم۔ یہ اور ان جیسے مقدس متدینؒ امام اور محتاط حضرات ہیں۔ سہو و نسیان تو ممکن ہے چونکہ یہ فطرتِ انسانی ہے۔ ان میں حفاظِ حدیث بھی تھے جن کو رواۃ کی دیانت، امانت و صداقت کا مکمل علم تھا جیسے امام زہری، امام شعبی، عروہ، قتادہ، سفیان ثوری وغیرہم جو ممتاز و مشہور ہیں۔ امام زہری کے متعلق تو بعض کہنے والوں نے یہ تک کہہ دیا کہ انہیں اس قدر احادیث، روایتیں، مغازی و سیر یاد تھیں کہ وہ صحیح و غیر صحیح کے امتیاز سے بھی قاصر نہ رہتے ہوں۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ جب کوئی طویل حدیث ہو اور مختلف طریقوں سے روایت کی جائے اور ان کی روایت کرنے والوں کے سلسلے بھی علیحدہ علیحدہ ہوں تو اس کے غلط یا کذب ہونے کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ مثلاً حضرت جابرؓ سے اونٹ خرید کیے جانے کی روایت ہے کہ حضورِ انورؐ نے حضرت جابرؓ سے ایک اونٹ خریدا۔ مختلف طریقوں سے یہ روایت ہے کہ آپ نے جابرؓ سے ایک اونٹ خریدا۔ مگر قیمت میں اختلاف ہے لیکن روایت صحیح ہے چونکہ اونٹ کا خریدنا

ثابت ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس کو بیان فرمایا ہے۔ اسی طرح جمہور علماءِ محدثین نے اس کو مان لیا ہے کہ بخاری و مسلم میں جتنی روایتیں ہیں، وہ صحیح ہیں اور یہ مسلمہ ہے کہ امت محمدیہ کا ممتاز طبقہ کسی غلط اصل پر اجماع نہیں کر سکتا، اور ایسا اجماع غلطی سے منزہ ہے۔ امت محمدیہ کے اہلِ علم اس پر بھی متفق ہیں کہ اگر کوئی خبرِ واحد ایسی ہو جس کی صحت پر امت کا اجماع ہو جائے تو وہ حقیقتاً صحیح ہی سمجھی جائے گی۔ اس اصل کو علماءِ حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ نے اپنے اصولِ فقہ میں تسلیم کیا ہے۔ بعض متاخرین نے اس اصل سے انحراف کیا ہے جن کی تعداد بے حد کم ہے اور انہوں نے اس مسئلہ میں بعض اہلِ کلام کی ہمنوائی کی ہے لیکن یہ کثرت اہلِ کلام فقہا اہلِ حدیث اور علماءِ سلف کا متفقہ یہی مذہب ہے۔ اکثر اشاعرہ کا جیسے ابی اسحٰق و ابن فورک ان کا بھی یہی مذہب ہے۔ البتہ ابن باقلانی نے انکار کیا ہے اور ان کے پیرو ابی المعالیؒ ابن حامدؒ ابن عقیلؒ ابن جوزیؒ ابن الخطیبؒ آمدی اور ان جیسے ہوگئے ہیں۔ ان کے ہم خیال ابو حامدؒ ابو الطیب، ابو اسحاق وغیرہ شافعیہ میں سے، قاضی عبدالوہاب وغیرہ مالکیہ میں سے شمس الدین مرغنی اور ان جیسے حنفیہ میں سے اور ایسا ہی ابو یعلیؒ ابو الخطابؒ ابوالحسن بن زاغوانی اور ان جیسے حنابلہ میں، یہ سب ان کی تائید میں ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب کسی خبر یا حدیث پر امت کا اجماع ہو جائے (امت کے اجماع سے علماء کا اجماع مراد ہے نہ کہ عوام کا)۔ جیسے احکام و امر و نواہی اور اباحت میں اہلِ علم کا اجماع معتبر ہے۔

ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ کوئی خبر مختلف طریقوں سے مروی ہو اور ایک راوی دوسری روایت کے راوی سے متاثر نہ ہوا ہو تو، وہ روایت قابل قبول ہے لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ راوی کیسے ہیں۔ راوی کے صدق و کذب پر رائے قائم کرنی لازمی ہے، پھر اس روایت کے متعلق فیصلہ کیا جائے گا۔

اسی طرح یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ سلسلۂ رواۃ میں اگر کوئی مجہول، ضعیف الحافظہ راوی ہو یا روایت مرسل ہو تو ایسی صورتوں میں ان روایتوں پر اعتبار کس طرح کیا جائے گا۔ علماء فرماتے ہیں کہ ایسی روایتوں کے راویوں کے احوال پر غور کیا جائے اور پھر ان روایتوں کی کثرت و شواہد پر نظر کر کے فیصلہ کرنا چاہیے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں میں وہی حدیث لکھتا ہوں جس کو معتبر سمجھ لیتا ہوں۔ عبداللہ بن لیہعہ بڑے نیک شخص تھے۔ یہ مصر

کے قاضی بھی تھے۔ ان کی روایتیں بکثرت ہیں۔ اتفاقاً ان کا کتب خانہ جل گیا۔ اس لیے بیشتر محدثین نے ان کی روایتوں پر اعتماد چھوڑ دیا لیکن اکثر محدثین نے ان سے روایتیں لیں۔ امام لیث بن سعد بھی ان کی روایتوں کو بہرحال صحیح سمجھ کر روایت کرتے تھے۔ اور یہ ایسی مثال ہے جیسے خراب حافظہ والے کی ہوتی ہے (یعنی جب کتاب میں لکھ لیا گیا تو اس کے جل جانے پر وہ ذخیرہ تلف ہوگیا۔ اگر حافظہ پر اعتماد ہوتا تو کتابت کی چنداں ضرورت نہ تھی۔)

واقعہ یہ ہے کہ فنِ عِلل حدیث ایک بہترین فن ہے۔ یہ اسی فن کے ماہر کا کام ہے، وہی بتا سکتا ہے کہ کب ثقہ راویوں سے غلطیاں ہوتی ہیں اور ضعیف راویوں کی روایت کن کن صورتوں میں قابلِ تسلیم ہوسکتی ہے۔ بطور مثال ہم چند واقعات پیش کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے بحالتِ احرام حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا اور خانہ کعبہ میں دو رکعت نماز پڑھی۔ یہ روایت خلافِ واقعہ ہے۔

عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ نے چار عمرے کیے۔ ایک ان میں سے رجب میں کیا۔ یہ بھی خلافِ واقعہ ہے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ جب آپ حجۃ الوداع کو مکہ میں تشریف لائے تو ملک میں امن تھا لیکن حضرت عثمانؓ کی جانب یہ قول منسوب ہے کہ ہم لوگ خوف کی حالت میں تھے، یہ خلافِ واقعہ ہے۔

ایک روایت بخاری کے رواۃ کے طریقہ سے مروی ہے کہ جہنم کبھی نہیں بھرے گی، جب تک کہ خدا تعالیٰ اس کے لیے ایک مخلوق پیدا فرما کر نہ بھر دے۔ یہ بھی خلاف ہے۔

اس لیے علماء کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک جماعت اہلِ کلام اور ان کے پیرووں کی ہے۔ یہ لوگ فنِ حدیث کو نہیں جانتے نہ ان کو صحیح وضعف کی تمیز ہے۔ عموماً صحیح روایتوں میں بھی شک کرتے ہیں اور ایک گروہ ان مدعیان متبع احادیث کا ہے جو کیسی ہی روایت کیوں نہ ہو، صرف لفظ حدیث سنتے ہی اس کو تسلیم کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ خواہ وہ حدیث ضعیف ہو یا کسی مشہور صحیح حدیث کی معارض ہی کیوں نہ ہو۔ وہ بغیر تنقید و تحقیق اس کو تسلیم کر کے طرح طرح کی تاویلات کرتے ہیں اور اہلِ علم کے سامنے اس کی توجیہات پیش کرتے ہیں حالانکہ ماہرینِ فنِ حدیث ایسی روایتوں کو غلط ہی تسلیم کرتے ہیں۔

جس طرح علتِ حدیث کے لیے دلائل ہیں اور صحیح و غیر صحیح روایتوں کے پہچاننے کے اصول ہیں، اسی طرح لغو اور جھوٹی حدیثوں کے پہچاننے کے طریقے ہیں۔ اہلِ بدعت یعنی گمراہ فرقوں نے بہت سی جھوٹی روایتیں صحیح روایتوں میں شامل کر دیں جیسے فضائل میں غلو کیا گیا۔ محرم کی دسویں تاریخ کے فضائل میں بہت سی روایتیں وضع کی گئیں۔ ایسی بھی روایتیں ہیں کہ جو شخص دو رکعت نماز پڑھے اس کو مثل انبیاء کے ثواب ملے گا۔

اس قسم کی موضوع روایتیں تفسیر کی کتابوں میں بہت ہیں جیسے ثعلبی، واحدی، زمخشری کی تفاسیر میں سورتوں کے فضائل میں جس قدر روایتیں ان حضرات نے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں وہ باتفاق اہلِ علم موضوع ہیں۔ ثعلبی بذاتِ خود اچھے اور دیندار تھے لیکن ان کی مثال رات کے وقت لکڑی کاٹنے والے کی طرح ہے۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں صحیح، ضعیف، رطب و یابس سب کچھ داخل کر لیا۔ واحدی زبانِ عرب کے بڑے ماہر ہیں لیکن وہ اتباعِ سلف و سلامتی کے راستے سے دور ہیں۔ بغوی کی تفسیر، ثعلبی کی تفسیر کا خلاصہ ہے اور انہوں نے موضوع روایتوں اور بدعتی فرقوں کے اقوال سے بحدِ امکان اپنی تفسیر کی حفاظت کی ہے لیکن بہرنوع تفاسیر میں موضوعات بہت ہیں۔ بسم اللہ زور سے پڑھنے اور حضرت علیؓ کی طویل روایت جس میں نماز کے خاتمہ پر صدقہ وغیرہ دینے کی ترغیب۔ یہ سب روایتیں ماہرینِ فنِ حدیث کے اصول سے موضوع ہیں یا جیسے اس آیت کی وضاحت میں (وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ) ہادی سے مراد حضرت علیؓ ہیں۔ یا جیسے اس آیت کی وضاحت میں (وَتَعِيَهَا أُذُنٌ وَّاعِيَةٌ) یہاں اُذن یعنی کان سے مراد حضرت علیؓ کے کان ہیں۔ یہ سب موضوعات ہیں۔

فصل چہارم

ایک قسم اختلاف یہ ہے کہ لوگ طریقۂ استدلال سے ناواقف ہیں۔ نہ وہ نقل کا استدلال جانتے نہ وہ عقل کا۔ وہ کتبِ تفاسیر جن میں صحابہؓ تابعین اور تبع تابعین سے روایتیں مع سند ہیں ان میں اختلاف اور غلطیاں کم ہوں گی جیسے مصنف عبدالرزاق، وکیع، عبدالرحمٰن بن ابراہیم، عبد بن حمید وحیم یا تفسیر امام احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ، بقی بن مخلد، ابوبکر بن منذر، سفیان بن عینیہ، سنید، امام ابوجعفر ابن جریر طبری، ابو حاتم، ابوسعید اشج، ابوعبداللہ ابن ماجہ، ابن مردویہ، ان کی تفاسیر اکثر و بیشتر اغلاط سے محفوظ ہیں۔

اختلاف کرنے والوں کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک طبقہ ایسا ہے کہ وہ معانیِ قرآن کا خاص لحاظ رکھتا ہے اور قرآن کے الفاظ کو ان کے معانی پر منطبق کرنے کی سعی کرتا ہے۔ دوسرا طبقہ صرف لغتِ عرب کا خیال رکھتا ہے لیکن اس کے پیشِ نظر یہ نہیں ہے کہ متکلم کا منشاء کیا ہے، مخاطب کون ہے، محل کلام کیا ہے، ٹھیٹ زبان میں الفاظ کے معنی بیان کر دیتا ہے۔ یہ دونوں طبقے اپنے اپنے نقطۂ خیال کے موافق تفسیر بیان کرتے ہیں۔ پہلا طبقہ، منشائے متکلم کا زیادہ لحاظ رکھتا ہے۔ دوسرا اس کے مقابلہ میں صرف الفاظ کے معانی پر زور دیتا ہے۔ اس وجہ سے بھی تفسیروں میں اختلاف نظر آتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ دونوں طبقوں سے بہت غلطیاں ہوئی ہیں۔ کہیں لفظ 'ہی' کو سلب کر دیا اور جو حقیقی معنی تھے اس کو نظر انداز کر دیا۔ کہیں ایسے معنی بیان کر دیے جو قرآن کا مفہوم ہی نہ تھا۔ جہاں کسی امر کا اثبات مقصود تھا، وہاں نفی ہوگئی اور جہاں نفی کا منشاء تھا، وہاں اثبات ہوگیا۔ اس وجہ سے نتیجہ میں کچھ غلطیاں ہوئیں۔ جس طرح تفسیرِ قرآن میں یہ غلطیاں ہوئیں، اسی طرح فنِ حدیث میں بھی کی گئی ہیں۔ اہلِ بدعت نے اپنے منشاء کے مطابق قرآن وحدیث کے معنی کر ڈالے اور اسی کو گمراہ طریقے کی بنیاد قائم کی۔ صراطِ مستقیم پر جو گروہ قائم ہے جیسے اسلافِ امتِ مرحومہ وائمہ کرام ان کا قدم جادۂ حق سے ذرا نہ ہٹا۔ انہیں گمراہ فرقوں میں خوارج، روافض، جہمیہ، معتزلہ، قدریہ، مرجیہ وغیرہ ہیں۔

مناظرہ و مباحثہ کے میدان میں سب سے زیادہ معتزلہ نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مذہبی نقطۂ نظر سے قرآن مجید کی تفاسیر کو مرتب کیا۔ جیسے تفسیر عبدالرحمٰن بن کیسان الاصم جو ابراہیم بن اسمٰعیل بن علیہ کے استاد ہیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ سے ان کا مناظرہ ہوا۔ اس طرح کتاب ابی علی جبائی کی اور تفسیر کبیر قاضی عبدالجبار بن احمد ہمدانی کی اور کتاب علی بن عیسیٰ رمانی کی اور کشاف ابی القاسم زمخشری کی۔ یہ لوگ اور ان جیسے معتزلی عقیدے کے تھے۔

معتزلہ کے پانچ اصول ہیں۔ توحید، عدل، منزل بین منزلتین، انفاذ وعید اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ ان کا عقیدۂ توحید جہمیوں کی طرح ہے۔ وہ صفات کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا نہیں دیکھتا۔ قرآن مخلوق ہے۔ خدا دنیا سے اوپر نہیں ہے۔ نہ علم اس کے ساتھ ہے نہ زندگی۔ نہ دیکھنے، سننے یا کلام کی صفات سے متصف ہے۔ عدل کے یہ معنی ہیں کہ خدا نے کائنات کو پیدا کرنا نہیں چاہا نہ اس کو پیدا کیا، نہ وہ اس پر قادر ہے۔ ان کے اصول کے مطابق مخلوق کے جملہ افعال خود اسی کے پیدا کردہ ہیں۔ خدا نے بھلائی برائی کو پیدا نہیں کیا نہ اس کا ارادہ کیا۔ البتہ جن کا شرعاً حکم دیا ہے، انہیں کا اس نے ارادہ بھی کیا تھا اور یہی اس کی مشیت ہے۔

معتزلہ کے اس اصول سے اکثر متاخرین شیعہ نے بھی اتفاق کرلیا ہے جیسے مفید، ابوجعفر طوسی اور ان دونوں جیسے اوروں نے۔ ابوجعفر طوسی نے جو قرآن کی تفسیر لکھی، وہ بھی اسی اصول کے پیشِ نظر ہے۔ اگرچہ اس طریقہ میں اثناءعشریہ کے بھی بہت سے اصول ہیں۔ معتزلہ بالکل شیعہ نہیں ہیں۔ وہ حضرت ابوبکرؓ و عثمانؓ و علیؓ کی خلافت کے قائل ہیں۔ خوارج کے اصول کے مطابق معتزلہ انفاذ وعید کے آخرت میں قائل ہیں۔ اس کے بھی قائل ہیں کہ گناہِ کبیرہ کی نہ شفاعت ہوسکتی ہے نہ اس کے عذاب سے نجات ممکن ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ان لوگوں کا بعض طبقاتِ مرجئہ، کرامیہ، کلامیہ اور ان کے پیرووں نے خوب رد کیا ہے، کہیں معقول دلائل ہیں اور کہیں غیر معقول دلائل لیکن یہ سب اُمتِ وسط کے جادۂ مستقیم سے علیحدہ ہیں۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ان فرقوں نے اپنے اپنے عقائد کے لحاظ سے قرآن کریم کے الفاظ کے معانی و مطالب کو بیان کیا۔ سلف صحابہ و تابعین و ائمہ کرام کی روایتوں سے اور آراء سے ان کی تفاسیر خالی ہیں۔ ان تفسیروں سے علم و مذہب کو سخت نقصان پہنچا۔ ان کی غلطیاں متعدد

حیثیتوں سے نمایاں ہیں۔ اگرچہ ان کی عبارتیں بے انتہا فصیح اور مکمل عربیت سے آراستہ ہیں۔ چنانچہ صاحب کشاف کی تفسیر فصاحت، معانی، بیان اور عربیت کی وجہ سے بے حد مقبول ہوئی اور ان کے عقائد باطلہ سے الا ماشاء اللہ لوگ گمراہ بھی ہوئے۔[۱]

---

[۱] ان مختلف فرقوں کی بنیاد اگرچہ سیاست سے ہوئی تھی مگر پھر انہوں نے مذہبیت کی آڑ لے کر نیا روپ لیا۔ بنو امیہ کے زمانہ میں چونکہ سفا کی کا بازار گرم تھا، طبیعتوں میں شورش پیدا ہوئی۔ جب کبھی شکایت کے الفاظ عوام سے نکلتے تو حکومت کے حامی یہ کہہ کر چپ کرا دیتے کہ جو کچھ ہوتا ہے۔ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ آمنا بالقدر خیرہ وشرہ۔ حجاج بن یوسف (جو ظلم و جور کا مجسمہ تھا) کے زمانہ میں ایک شخص معبد جہنی نمایاں ہوا۔ یہ صحابہ کو دیکھے ہوئے تھا۔ وہ حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ کے حلقۂ درس میں شریک تھا۔ ایک دن اس نے آپ سے پوچھا کہ بنو امیہ کی طرف سے ''قضا و قدر'' کا جو عذر پیش کیا جاتا ہے، کہاں تک صحیح ہے۔ امام صاحب نے فرمایا: ''یہ خدا کے دشمن جھوٹے ہیں۔'' معبد خود بنو امیہ کے ظلم سے تنگ تھا۔ بس اس پر اس نے علانیہ بغاوت شروع کر دی، اور مارا گیا۔ (تاریخ مقریزی جلد ۲/۳۵۶)

معبد کے بعد غیلان دمشقی نے اس خیال کو ترقی دی۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو اس نے آپ کو بڑی بے باکی سے خط لکھا اور بنو امیہ کے مظالم پر توجہ دلائی۔ آپ نے اس کو بلا کر توشک خانہ کے نیلام پر مقرر فرما دیا۔ وہ علی الاعلان نیلام کرتا جاتا تھا اور پکار کر کہتا جاتا تھا کہ یہ وہ مال ہے جو ظلم سے لیا گیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد ہشام بن عبدالملک خلیفہ ہوا۔ وہ غیلان کی زبان درازی سے واقف تھا۔ پہلے اس کے ہاتھ پیر کٹوا دیے پھر اس جرم میں جان سے مارا گیا۔ لیکن یہ گروہ برابر در پردہ ترقی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ خود خاندان بنی امیہ میں یزید بن ولید نے یہ مذہب اختیار کر لیا۔ ولید تخت نشینی کے ساتھ عیش پرستی میں مشغول ہوا۔ علانیہ میخواری اور عیاشی شروع کی۔ یزید نے امر بالمعروف کے دعوے سے علم بغاوت بلند کیا اور ہزاروں معتزلہ اس کے ساتھ ہو گئے۔ یہ پہلا دن تھا کہ اعتزال نے تخت حکومت پر جگہ پائی (شرح ملل ونحل) فرقہ معتزلہ کے پانچ اصولوں میں سے جن کا نام عدل اور امر بالمعروف ہے، ان کا آغاز یہیں سے ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ خلق قرآن، صفاتِ باری تعالیٰ کی بحثیں چلیں اور اس طرح چند ہی روز میں پانچ اصول مرتب ہو گئے۔ امر بالمعروف وعدل، قدر و جبر، عقائد و اعمال، عقل و نقل، صفات الٰہی کا اثبات و نفی۔

یہ بات زیر بحث لائی گئی کہ خدا کے متعلق قرآن مجید میں جو الفاظ استعمال ہوئے، جو جسمانیات کے لیے ضروری ہیں مثلاً عرش پر متمکن ہونا، قیامت کے دن نمودار ہونا، ان کے حقیقی معنی کئے جائیں یا مجازی۔ پہلی شق کے ماننے والے محدثین اور اشعریہ ہیں جن میں بعض بڑھتے بڑھتے مجسمہ اور مشبہ پیدا ہو گئے جو خدا کے ہاتھ پاؤں تک ماننے لگے۔ دوسرے احتمال کے قائل ہوئے جو معتزلہ ہیں جن کا دوسرا نام منکرین صفات ہے۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

میں نے مفسرین علماء اور دوسروں کی کتابوں میں دیکھا ہے کہ وہ کشاف کی تعریف کرتے ہیں اور اپنی کتابوں میں کشاف کے عقائدِ فاسد کو تو نقل کر دیا مگر اس کا کوئی شافی جواب نہ دیا۔

اس کے علاوہ اور گروہ گمراہوں کے ہیں جیسے شیعہ امامیہ، فلاسفہ، قرامطہ وغیرہم۔ ان لوگوں نے اس قدر گمراہی کی تفسیریں مرتب کی ہیں جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے مثلاً روافض کی تفسیروں کے چند اقتباس پیش ہیں۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ. یہاں ابوبکر وعمر مراد ہیں۔

لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ. یعنی اگر علی کی خلافت میں کسی کو شریک کرو گے تو تمہارے عمل ساقط ہو جائیں گے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً. یہاں بقرہ سے عائشہ مراد ہیں۔

قَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ. اس سے طلحہ و زبیر مراد ہیں۔ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ اس سے علی و فاطمہ مراد ہیں۔ اَللُّؤْلُؤُ وَ الْمَرْجَانَ اس سے حسن حسین مراد ہیں۔ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنَاهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ یہاں حضرت علی مراد ہیں۔ عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ یہاں خلافتِ حضرت علی مراد ہے۔ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ

(پچھلے صفحہ سے بقیہ حاشیہ) ان چند مثالوں سے ان کا فرق معلوم ہو سکتا ہے۔ اشعریہ۔ خدا کو عدل اور انصاف کرنا ضروری نہیں۔ معتزلہ۔ ضروری ہے۔

اشعریہ۔ کوئی شے فی نفسہٖ اچھی یا بری نہیں ہے، شارح جس چیز کو اچھا کہہ دیتا ہے، وہ اچھی ہے اور جس کو برا کہے، وہ بری ہے۔

معتزلہ۔ ہر شے پہلے سے اچھی یا بری تھی۔ شارع اسی چیز کو اچھا کہتا ہے جو فی نفسہٖ اچھی تھی۔

معتزلہ۔ کلام الٰہی جو خدا کی صفات قدیمہ میں ہے وہ قدیم ہے لیکن جو الفاظ حضورِ انور پر نازل ہوئے وہ مخلوق اور حادث تھے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ کلام الٰہی ہر حال میں قدیم ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ نے اس کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

''میں عقائد میں گفتگو کرنا ناپسند کرتا ہوں اور ہمیشہ ہمارے شہر کے علماء بھی اس کو ناپسند کرتے رہے ہیں مثلاً جہم کی رائے اور قدر میں گفتگو کرنا، میں بحث اس امر میں پسند کرتا ہوں جس کے تحت عملی زندگی ہو۔ لیکن خدا کے عقیدے، اس کی ذات وصفات کے متعلق سکوت پسندیدہ ہے۔ چونکہ ہمارے شہر کے علماء کی روش یہ تھی کہ وہ صرف ان امور میں گفتگو کرتے تھے جن کا تعلق عمل سے ہو۔''

وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَ ھُمْ رَاکِعُوْن اس سے حضرت علی مراد ہیں اور اس سلسلہ میں ایک موضوع حدیث بھی بیان کی جاتی ہے۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَ رَحْمَۃٌ یہ حضرت حمزہؓ کی شہادت پر حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئی۔ اسی طرح دوسرے گروہ کے مفسرین نے بھی غلطیاں کی ہیں چنانچہ اَلصَّابِرِیْنَ وَ الصَّادِقِیْنَ وَ الْقَانِتِیْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ کی تفسیر میں صابرین سے رسول کریم علیہ السلام، صادقین سے حضرت ابوبکرؓ، قانتین سے حضرت عمرؓ، منفقین سے حضرت عثمانؓ، مستغفرین سے حضرت علیؓ مراد ہیں۔ مُحَمَّدُ الرَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کی تفسیر میں معہ حضرت ابوبکر، اشداء علی الکفار سے حضرت عمرؓ، رحماء سے حضرت عثمانؓ، تراہم رکعًا سجدًا سے حضرت علی مراد ہیں اور سب سے زیادہ حیرت ناک تفسیر یہ ہے۔ وَالتِّیْنِ یعنی ابوبکر، وَالزَّیْتُوْنِ یعنی حضرت عمر، وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ حضرت عثمان، وَھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ سے حضرت علی مراد ہیں۔ اس قسم کی خرافات بکثرت تفاسیر کی کتابوں میں موجود ہیں جو قرآن کے معانی سے بالکل علیحدہ ہیں۔

خدا کے اس ارشاد کے معنی وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ میں وہ تمام افراد داخل ہیں جو ان صفات سے متصف تھے، کسی خاص شخص کے لیے یہ آیت یا اس کے جملے نہیں ہیں۔ اسی طرح اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا سے صرف حضرت علیؓ کی ذات مقصود ہو، یہ غلط ہے۔ اسی طرح اس آیت لَایَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قَاتَلَ سے حضرت ابوبکرؓ کو سمجھنا غلطی ہے۔

کتبِ تفاسیر میں تفسیر ابن عطیہ اور اس جیسی تفسیریں زمخشری کے بدعات سے پاک ہیں۔ یہ تفسیریں وہ ہیں جن میں اہل سنت والجماعت کے اصول کو ملحوظ رکھا گیا ہے تاہم ان تفاسیر میں بھی اگر علمائے سلف اور صحابہ کرام کے ارشادات سے استفادہ ہوتا تو یہ اور بہتر ہو جاتیں۔ چونکہ ان کا ماخذ زیادہ تر محمد ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ہے اور یہ واقعہ ہے کہ ابن جریر کی تفسیر انتہائی عزت و احترام کے ساتھ دیکھنے کے قابل ہے لیکن ابن عطیہ نے بالکل ابن جریر کی نقل نہیں کی بلکہ انہوں نے اپنے خیال کے مطابق ایک ''قول محقق'' پیدا کیا ہے، اور اصول تحقیق وہ مقرر کیے ہیں جو اہلِ کلام نے وضع کئے ہیں اور اہلِ کلام کے وہی اصول ہیں جو معتزلہ کے ہیں۔ تاہم یہ تفسیر بمقابلہ معتزلہ کی تفاسیر کے سنت و حدیث سے زیادہ قریب ہے۔

ہمارا فرض یہ ہے کہ ہر شخص کی حیثیت کے مطابق وضاحت کریں، اس لیے یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ تمام کتبِ تفسیر اپنے اپنے مذہب کے اصول کے پیشِ نظر مُرتب کی گئی ہیں۔ صحابہ، تابعین، تبع تابعین یا ائمہ اسلام سے جب کسی آیت کی تفسیر معلوم ہوئی ہو اور وہ اس شخص کے مذہب و اعتقاد کے مطابق ہوئی یا کسی فرقہ نے کسی اور قول کے مطابق اپنے مذہب کے لحاظ سے ایسی تفسیر کی جو کسی صحابی یا تابعی سے مروی یا منقول نہیں ہے، تو وہ ایسی باتوں میں معتزلہ اور اہلِ بدعت کے ہمنوا ہو گئے۔

ہمارے خیال میں جو شخص صحابہ یا تابعین کے اقوال سے علیحدہ کوئی صورت اختیار کرے گا، وہ بدعتی ہے، اگرچہ یہ اصول ہی کیوں نہ ہو کہ مجتہد سے اگر لغزش ہو تو قابلِ درگزر ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ علمِ تفسیر کے متعلق صحیح طریقوں کو واضح طور پر بیان کر دیں، چونکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کریم صحابہ نے پڑھا، ان سے تابعین نے پڑھا اور سمجھا، پھر تبع تابعین نے ان سے پڑھا اور سمجھا اور یہ حضرات صحابہ و تابعین حضور انور کے حقائق سے آشنا تھے اور یہی طبقہ قرآن کے معانی اور اس کی تفسیر سے باخبر تھا، اس لیے جو شخص بھی ان کی تفسیر یا وضاحت کے خلاف تفسیر کرے گا تو وہ ناقابلِ قبول ہوگی اور اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ عقل و نقل سے کس کس طرح تفاسیر کی کتب میں غلطیاں کی گئی ہیں۔ یہاں توضیح مزید مقصود ہے۔ بہت بڑی وجہ اختلافِ تفسیر کی یہ ہے کہ اہلِ بدعت نے اپنے اپنے مذہب کی نصرت و حمایت کے لیے تحریف تک کر ڈالی اور لفظ تک بدل ڈالے جس سے قرآن کے معنی تک بدل گئے اور اختلاف بڑھ گیا اور خدا اور رسول کے کلام کے وہ معانی اور توضیحات کی گئیں جو منشائے خداوندی یا منشائے نبوت کے بالکل خلاف ہیں اور ایسی تاویلات کی گئیں جو تحریف کی حد تک پہنچ گئیں۔

علم کا اصول یہ ہے کہ انسان اس قدر تحقیق کرے جس سے یہ انکشاف ہو جائے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔ اس کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اسلافِ کرام کی تفاسیر کیا ہیں اور اہلِ بدعت کی تفاسیر ان کے مقابلہ میں کیا ہیں۔ پھر اس کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ اہلِ بدعت نے قرآن کی تفسیر میں کیا کیا فساد برپا کیا ہے۔ اس لیے علماء نے تفسیر و حدیث کے جانچنے کے لیے ''سند'' کا طریقہ منضبط کیا، اس کے اصول وضع کیے، توضیحات کیں تاکہ صحیح وضعیف و موضوع کا علم ہو سکے، اسی طرح ایک گروہ صوفیہ کا پیدا ہوا۔ انہوں نے بھی اپنے مزعومات و

عقائد کے لحاظ سے قرآن کی تفسیر میں دخل دے کر سلف کے اتباع سے انحراف کیا۔ اسی طرح بعض واعظ اور بعض فقہا بھی اسی قسم کی غلطیوں کے مرتکب ہوئے جن کا تذکرہ ابوعبدالرحمٰن سلمی نے حقائق التفسیر میں کیا ہے اور جو دلیل پیش کی اور جس پر وہ دلیل پیش کی، دونوں سے فساد ہی کو ترقی ہوئی ہے۔

فصل پنجم

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تفسیر کا صحیح طریقہ کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے کرنی چاہیے۔ چونکہ اگر کسی جگہ کوئی آیت مجمل ہے تو دوسری جگہ وہ مفصل بھی موجود ہے۔ اگر کہیں اختصار سے بیان فرمائی گئی ہے تو دوسری جگہ اس کو شرح و بسط سے بیان فرما دیا گیا ہے۔ اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو پھر صحیح حدیث سے مدد لینی چاہیے۔ چونکہ حدیث ہی، حقیقت میں قرآن کی تفصیل و شرح ہے، بلکہ امام ابوعبداللہ محمد ابن ادریس شافعی رحمۃ اللہ نے تو یہ فرمایا ہے کہ جو کچھ حضور علیہ السلام نے حکم دیا ہے، سب کچھ قرآن ہی کے تحت اور اتباع میں ہے اور ان کا استدلال اس آیت سے ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرَاكَ اللّٰهُ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا۔" تحقیق ہم نے اس کتاب کو تم پر نازل کیا ہے، حق کے ساتھ تاکہ تم لوگوں کو اس کتاب سے حکم دو۔ جو کچھ تمہیں خدا نے بتایا ہے اور خیانت کرنے والوں کے ساتھ جھگڑا کرنے والے نہ بنو۔" اور وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ" اور ہم نے تم پر ذکر (قرآن) کو نازل کیا تاکہ تم لوگوں پر ظاہر کر دو جو کچھ ان کے لئے نازل کیا گیا ہے تاکہ وہ اس پر غور کریں۔"

اور یہ ارشاد ہے: وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔" ہم نے اس لیے اس کتاب کو تم پر نازل کیا ہے کہ تو ان پر ظاہر کر دے ان چیزوں کو جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور ہدایت و رحمت اس قوم کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں۔

اسی بناء پر حضورِ انور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے: "یاد رکھو میں قرآن اور اس جیسی چیز کو اسی کے ساتھ لایا ہوں۔" اس سے مقصد یہ ہے کہ وہ "سنتِ رسول اللہ" ہے، جس کا نزول بھی مثلِ قرآن کے حضورِ انورؐ کے قلب مبارک پر ہوا ہے اور اس کو بھی اسی طرح پڑھا جاتا ہے

جیسے قرآن کریم کو پڑھا جاتا ہے۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے مماثل ائمہ کرام نے اس سلسلہ میں بکثرت دلائل بیان فرمائے ہیں جن کی وضاحت اور بیان کا یہ موقع نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرآن شریف کی تفسیر پہلے تو قرآن ہی سے کی جائے پھر اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو صحیح حدیث سے کی جائے۔ حضور علیہ السلام نے حضرت معاذؓ کو جب یمن روانہ کیا تو دریافت فرمایا کہ تم کس طرح فیصلہ کرو گے۔ انہوں نے عرض کیا: قرآن سے۔ فرمایا: اگر وہ بات تم کو قرآن میں نہ مل سکے تو۔ انہوں نے عرض کیا: سنتِ رسول اللہ کے مطابق۔ فرمایا اگر اس میں بھی نہ ملے تو۔ عرض کیا: میں اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا۔ اس پر حضورِ انور نے حضرت معاذؓ کے سینہ پر ہاتھ مار کر فرمایا: اللہ کا شکر ہے کہ جس نے خدا کے رسول کے رسول کو اس کی توفیق عطا فرمائی جس سے خدا کا رسول متفق ہے۔ یہ روایت بسندِ صحیح مسانید اور اصحابِ سنن نے روایت کی ہے۔

ان حالات میں یہ بالکل صاف ہے کہ جب ہم کو قرآن کی تفسیر قرآن سے یا صحیح روایت سے نہ معلوم ہو سکے تو پھر ہم کو صحابۂ کرامؓ کے اقوال پر غور کرنا چاہیے۔ چونکہ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ فلاں آیت کس موقع پر اور کیوں نازل ہوئی ہے۔ ان کا علم صحیح اور ان کی فہم معتبر ہے۔ خصوصاً طبقۂ صحابہؓ کے ممتاز ترین علماء و اکابرین جیسے خلفاءِ راشدین اور ائمۂ ہدیٰ جیسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہم۔ امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری رحمتہ اللہ نے فرمایا: ہم سے ابوکریب نے حدیث بیان کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم سے جابر بن نوح نے اور انہوں نے اعمش سے انہوں نے ابی الضحیٰ سے انہوں نے مسروق سے انہوں نے کہا کہ مجھ سے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قسم ہے خدا کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ قرآن مجید کی ہر آیت کے متعلق میں یہ جانتا ہوں کہ کس کے بارے میں اور کہاں وہ نازل ہوئی ہے۔ میں اپنے سے زیادہ کسی کو ایسا جاننے والا نہیں سمجھتا۔ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ اور کوئی جانتا ہے تو میں اس علم کو اس سے بھی حاصل کروں گا۔ اعمش نے یہ بھی ابی وائل سے انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ ہم میں سے جب کوئی شخص قرآن کی دس آیتیں پڑھتا تھا تو پھر وہ آگے نہیں بڑھتا تھا، تا آنکہ ان آیات کے معانی اور مفہوم سے پوری طرح واقف اور باخبر نہ ہو جائے اور ان پر عمل کرنے کا طریقہ معلوم نہ کر لے۔ ان صحابہ

میں علم کے دریا حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں جو حضورِ انورؐ کے چچازاد بھائی اور ترجمان القرآن ہیں جن کے لیے حضورِ انورؐ نے یہ دعا کی تھی۔ ''اے اللہ اس کو دین کے علم کی سمجھ عطا فرما، اور اس کو تاویل کا علم سکھا دے۔'' حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا وسیع علم اور قرآن کا ترجمان ہونا حضور کی دعا کی برکت سے ہوا۔

امام ابن جریر طبری محمد بن بشار سے وہ وکیع سے وہ سفیان سے وہ اعمش سے وہ مسلم سے وہ مسروق سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا قرآن کریم کے بہترین ترجمان حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں۔ اسی طرح کی ایک روایت یحییٰ بن داوٗد نے اسحٰق ازرق سے انہوں نے سفیان سے انہوں نے اعمش سے انہوں نے مسلم بن صبیح ابی الضحیٰ سے انہوں نے مسروق سے انہوں نے عبداللہ بن مسعودؓ سے کہ آپ نے فرمایا: قرآن کے بہترین ترجمان عبداللہ بن عباسؓ ہیں۔ پھر اسی روایت کو بندار سے انہوں نے جعفر بن عون سے انہوں نے اعمش سے انہی الفاظ سے روایت کیا ہے اور یہ روایت بسندِ صحیح عبداللہ بن مسعودؓ سے ثابت ہے کہ آپ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق یہ الفاظ فرمائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا انتقال بروایت صحیح ۳۳ھ میں ہوا اور ان کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ۳۶ سال زندہ رہے۔ اس سے تم کو اندازہ ہوسکتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے ان کے بعد لوگوں نے کس قدر علم حاصل کیا ہوگا۔ اعمش کہتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو مکہ مکرمہ میں اپنا قائم مقام یعنی امیرِ حج بنا کر بھیجا، انہوں نے وہاں خطبہ دیا۔ بعض روایتوں میں سورۂ بقر اور بعض میں سورۂ نور کی جو بے مثل اور بے مثال تفسیر بیان کی کہ اگر اس کو ترک، روم اور دیلم سن لیتے تو سب اسلام قبول کر لیتے۔

ان دونوں قابلِ عظمت بزرگ ہستیوں سے یعنی عبداللہ بن مسعود و عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے زیادہ اسمٰعیل بن عبدالرحمٰن السدی نے اپنی تفسیرِ کبیر میں روایتیں نقل کی ہیں لیکن بعض بعض جگہ اہلِ کتاب کی روایتیں نقل کر دی ہیں اور یہ اس بناء پر کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: میری ایک بات بھی تم کو معلوم ہو تو لوگوں تک پہنچا دو اور اگر بنی اسرائیل سے تم کو کوئی روایت معلوم ہو تو اس کے روایت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ جو مجھ

پر جان کر جھوٹ بولے گا، اس کا مسکن جہنم ہے۔ اس روایت کو امام بخاری رحمۃ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ اس وجہ سے حضرت عبداللہ بن عمر کو معرکۂ یرموک میں دو بورے بھرے ہوئے اہل کتاب کی کتابوں کے مل گئے تھے۔ وہ اس حدیث کے مفہوم کو سمجھ کر ان کتابوں میں سے بعض روایتوں کو بیان فرما دیا کرتے تھے۔ لیکن یہ یاد رہنا چاہیے کہ اہلِ کتاب کی روایتیں بطور شہادت کے لی جا سکتی ہیں، ان پر کسی اعتقاد کی بنیاد قائم نہیں کی جا سکتی۔ اہلِ کتاب کی روایتوں کی تین قسمیں ہیں۔

ایک قسم تو وہ ہے جن کی تصدیق ہماری کتابوں سے ہو سکتی ہے، وہ صحیح ہیں۔

دوسری قسم وہ ہے جن کے غلط ہونے پر ہم اس وجہ سے یقین کرتے ہیں کہ وہ ہمارے قرآن کے خلاف ہیں۔

تیسری قسم وہ ہے جن پر سکوت کیا جا سکتا ہے۔ پہلے قسم کی، دوسرے قسم کی، ہم ان کی نہ تصدیق کر سکتے ہیں نہ تکذیب البتہ بطور حکایت کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تاہم ایسی روایتوں سے دینی امور میں کوئی فائدہ نہیں ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ خود علماءِ اہلِ کتاب میں بھی اس قسم کی روایتوں میں کثرت سے اختلاف ہے اور یہی وجہ ہے کہ علماءِ مفسرین کی تفسیروں میں اختلاف رونما ہوا۔ مثلاً اصحابِ کہف کے نام کیا ہیں، ان کے کتے کا کیا رنگ تھا، وہ کتنے تھے، حضرت موسیٰؑ کا عصا کس درخت کا تھا، حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں جن چار پرندوں کے زندہ ہونے کا تذکرہ ہے وہ کون سے پرند تھے، حضرت موسیٰؑ نے جس گائے کو ذبح کرا کر مقتول کو مارا تھا، وہ کہاں اور کس عضو سے مارا تھا، وہ کون سا درخت تھا جس سے حضرت موسیٰؑ پر کلامِ الٰہی براہِ راست نازل ہوا۔ ایسی بہت سی باتیں ہیں، جن کو خدا نے قرآن میں مبہم بیان فرمایا ہے، اس لیے کہ ان کے سمجھنے میں نہ دنیا کا فائدہ ہے نہ دین کا فائدہ ہے۔ ہاں مختلف روایتوں کا نقل کرنا تو جائز ہے مگر سعی و تلاش کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ تا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَدًا ''عنقریب کہیں گے کہ تین تو وہ خود تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا اور کہیں گے کہ پانچ تو وہ خود تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب اٹکل کی باتیں ہیں۔ اور کہیں گے کہ وہ خود تو سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ تم کہہ دو کہ میرا خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔ اس کا بہت کم لوگوں کو علم عطا فرمایا ہے اور کسی سے اس کے متعلق سوال نہ کرو۔''

اس آیت کریمہ میں ہم کو وہی تعلیم دی گئی ہے کہ ان حالتوں میں ہم کیا کریں۔ اس آیت میں خدا نے تین قول بیان فرمائے ہیں۔ پہلے دو قولوں پر تو یہ فرمایا کہ یہ اٹکل کی باتیں ہیں۔ تیسرے قول پر کچھ تصریح صحیح یا غلط ہونے کی نہیں فرمائی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی تعداد صحیح ہے۔ اگر غلط ہوتی تو مثل ہر دو اقوال ان پر تنقید فرمائی جاتی اور یہ بھی فرمادیا کہ ان کی تعداد معلوم کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ چونکہ پھر ارشاد ہوتا ہے قُلْ رَّبِّیْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ کہہ دو کہ تمہارا رب ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے اور اس نے بہت تھوڑے آدمیوں کو اس کی اطلاع دی ہے۔ پھر اس کے بعد فرمایا فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ یعنی تم اس کے متعلق کسی سے سوال نہ کرو (چونکہ وہ بلا تحقیق باتیں کہیں گے) اس لحاظ سے یہ بہتر تعلیم دی گئی ہے کہ جن امور میں دین و دنیا کا کوئی فائدہ نہ ہو، ان پر دماغ سوزی فضول ہے۔ ممکن ہے کہ دماغی الجھن بڑھ کر کسی نقصان کا سبب بن جائے۔

فصل ششم

ایسی صورت میں جب قرآن کی تفسیر قرآن سے یا حدیث صحیح سے یا ارشاداتِ صحابہ سے معلوم نہ ہو سکے تو ایسی حالت میں ائمہ تابعین کی توضیحات پر توجہ کرنا چاہیے۔ جیسے مجاہد چونکہ وہ تفسیرِ قرآن کے بڑے ماہر اور علامہ ہیں۔ جیسے محمد بن اسحٰق نے ابان بن صالح سے روایت کیا ہے اور انہوں نے مجاہد سے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے قرآن مجید شروع سے آخر تک تین مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو سنایا، ہر ہر آیت پر ٹھہر کر اس کو سمجھا اسی واسطہ سے امام ترمذی حسین بن مہدی بصری سے راوی ہیں کہ انہوں نے عبدالرزاق سے انہوں نے معمر سے انہوں نے قتادہ سے سنا تو وہ کہتے تھے کہ قرآن کی ایسی کوئی آیت نہیں ہے جس کے متعلق میں نے کچھ نہ کچھ نہ سنا ہو۔ اور اسی سند سے ابن ابی عمر نے سفیان بن عیینہ سے انہوں نے اعمش سے روایت کیا ہے کہ ان سے مجاہد نے بیان کی کہ اگر میں عبداللہ بن مسعودؓ سے قرآن سیکھتا تو پھر مجھے عبداللہ بن عباسؓ سے بہت سی باتوں کے دریافت کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

ابن جریر کہتے ہیں ہم سے ابوکریب ان سے طلق بن غنام نے انہوں نے عثمان مکی سے انہوں نے ابی ملیکہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے مجاہد کو دیکھا ہے کہ ان کے پاس تختیاں رہتی تھیں اور وہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے قرآنی آیات کی تفسیر دریافت کر کے ان پر لکھا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے حضرت سفیان ثوری فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم کو تفسیرِ مجاہد مل جائے تو وہی کافی ہے۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے مماثل حضرت سعید بن جبیر، عکرمہ مولیٰ ابن عباس و عطاء ابن ابی رباح، حسن بصری، مسروق بن اجدع، سعید بن مسیب، ابی العالیہ، ربیع بن انس، قتادہ، ضحاک بن مزاحم وغیرہم تابعین و تبع تابعین کے اقوال قابلِ استناد ہیں۔ بظاہر ان حضرات کے الفاظ میں باہمی فرق نظر آئے گا لیکن یہ اختلاف نہیں ہے بلکہ طرزِ بیان کا فرق ہے۔ کسی نے اس بات کو مع اس کے لوازم کے بیان کر دیا، کسی نے اس کی مثال بیان کر دی، کسی نے صرف

اصل چیز ہی کو بیان کر دیا۔ اس لیے عقلمند کو چاہیے کہ وہ اپنی سمجھ سے کام لے اور اس طرزِ اداو بیان کے فرق کو معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ خدا ہدایت فرمانے والا ہے۔

امام شعبہ بن حجاج اور ان کے علاوہ اور علماء نے فرمایا ہے کہ فروع (جزئیات) میں تابعین کے اقوال حجت نہیں ہیں تو پھر تفسیر میں ان کے اقوال کیسے قابلِ حجت ہو سکتے ہیں۔ ہم بھی اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ اگر ان میں واقعی اختلاف ہو تو ان میں ترجیح کی ضرورت نہیں ہے۔ صحابہ کے ارشادات کی جانب رجوع کرنا چاہیے لیکن اگر ان میں اتفاق ہو (اور بظاہر معنی میں فرق نظر نہ آتا ہو) تو پھر اس کے حجت ہونے میں شک کرنے کی حاجت نہیں ہے اور اگر یہ صورت نہ ہو تو پھر لغتِ قرآن حدیث یا عام لغتِ عرب سے فیصلہ کرنا چاہیے۔ محض اپنی رائے سے تفسیرِ قرآن کرنا حرام ہے۔ مؤمل کہتے ہیں، ان سے سفیان نے، ان سے عبدالاعلیٰ نے ان سے سعید ابن جبیر نے ان سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ جس نے قرآن میں بغیر علم کے کچھ کہا تو اپنا مسکن جہنم کو بنا لے۔

اسی سلسلہ میں امام ترمذی عبد بن حمید سے روایت کرتے ہیں، وہ حسان بن بلال سے ان سے سہیل بن حزم قطعی کے بھائی نے انہوں نے ابو عمران جونی سے انہوں نے جندب سے، وہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے، جس نے قران کریم میں اپنی رائے سے کچھ کہا اگرچہ وہ ٹھیک بھی ہو تاہم اس نے خطا کی۔ ترمذی کہتے ہیں، حدیث غریب ہے اور بعض اہلِ حدیث نے اس حدیث کے راوی سہیل بن ابی حزم میں کلام کیا ہے۔[۱]

اس حدیث کے موافق میں بعض اہلِ علم نے اصحاب نبی علیہ السلام سے بھی روایتیں کی ہیں کہ صحابۂ کرام قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرنے میں بے حد سخت اور محتاط تھے لیکن قتادہ اور مجاہد یا ان جیسے اعلیٰ اہلِ علم سے جو تفسیری روایتیں مروی ہیں۔ ان پر یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے باوجود ان احکام کے جاننے کے اپنی رائے سے بغیر کسی علم کے تفسیر کی ہو۔ انہیں حضرات

---

۱ نوٹ: سہیل ابن ابی حزم کے متعلق میزان الاعتدال امام ذہبی جلد ۱/۴۳۲ میں مسطور ہے۔ انہوں نے ابی عمران جونی اور ثابت سے روایتیں کی ہیں اور ان سے شریح بن نعمان ہدیہ اور ایک گروہ نے روایتیں کی ہیں۔ یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ یہ نیک ہیں۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ یہ قوی نہیں ہیں اور یہی رائے امام بخاری و امام نسائی کی ہے۔

نے اس روایت کو بیان کیا ہے، اس لیے اگر کوئی شخص صرف اپنی رائے سے بغیر کسی علم کے قرآن کی تفسیر کرے تو وہ اس جرم کا مرتکب ہوگا جس کے لیے وہ مامور نہیں ہے اور غلط راستہ پر گامزن ہوگا۔ اگر وہ ٹھیک معنی پر پہنچ بھی گیا تو بھی غلط ہے۔

جیسے کوئی امیر اپنی جہالت سے مسلمانوں کا فیصلہ کرے تو وہ جہنمی ہے۔ اگر وہ امیر باوجود جہل کے صحیح فیصلہ کر سکا تو اس کا یہ ہلکا سا جرم ضرور ہوگا۔ (خدا ہی اس کو بہتر جانتا ہے۔)

قرآن مجید میں زنا کی تہمت لگانے والوں کو کاذب قرار دیا ہے (فَـاِذْلَـمْ یَـاْتُـوْا بِالشُّهَدَاءِ فَاُولٰٓئِکَ عِنْدَاللّٰهِ هُمُ الْکَاذِبُوْنَ) اگر وہ گواہ نہ لائیں تو وہ خدا کے نزدیک جھوٹے ہیں'' یعنی تہمت لگانے والا جھوٹا ہوگا، اگر چہ واقعی ارتکابِ فعل ہوا ہو، تا آنکہ وہ گواہ نہ پیش کرے۔ بدیں وجہ جماعت سلف صالحین بغیر علم کے تفسیر سے احتراز کرتے تھے۔ جیسا کہ شعبہ نے سلیمان سے انہوں نے عبداللہ بن مرہ سے انہوں نے ابی معمر سے روایت کیا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے تھے کہ کون سی زمین مجھے پناہ دے گی اور کون سا آسمان مجھے اپنے سایہ میں لے گا اگر میں بغیر علم کے خدا کی کتاب میں کچھ کہوں۔ ابوعبید قاسم بن سلام نے محمود بن یزید سے انہوں نے عوام بن حوشب سے انہوں نے ابراہیم تیمی سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اس آیت کے معنی دریافت کئے گئے وَفَـاکِهَةً وَّاَبًّـا اس پر آپ نے فرمایا: خدا کی کتاب میں جس کو میں جانتا نہیں ہوں، اس کے کیا معنی بیان کروں۔ کون سی زمین مجھے پناہ دے گی اور کون سا آسمان مجھے اپنے سایہ میں لے گا۔

ابوعبید سے ایسی ہی روایت ہے جو یزید سے، انہوں نے حمید سے انہوں نے حضرت انسؓ سے روایت کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر اس آیت کو پڑھا وَ فَـاکِهَةً وَّاَبًّـا پھر فرمایا فاکہہ کو تو ہم سمجھتے ہیں لیکن ''ابًّا'' کے معنی کیا ہیں؟ پھر خود ہی فرمایا: اے عمر یہ تو تکلف ہے۔

عبد بن حمید نے سلیمان بن حرب سے، انہوں نے حماد بن زید سے، انہوں نے ثابت سے انہوں نے حضرت انسؓ سے روایت کیا کہ ہم لوگ حضرت عمرؓ کے پاس تھے اور حضرت عمرؓ کے کرتہ میں چار پیوند لگے ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس آیت کو پڑھا وَفَـاکِهَةً وَّاَبًّا پھر خود ہی فرمایا کہ یہ 'اب' کیا چیز ہے۔ پھر کہا کہ یہ تو تکلف ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے معنی ہی معلوم کئے جائیں۔ یہ روایتیں اس پر محمول کی جاسکتی ہیں کہ ان دونوں حضرات نے لفظ 'اب' کی

وضاحت پر توجہ نہیں فرمائی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ 'اب' ایک قسم کی نباتات سے ہے جو چارے کے کام آتی ہے۔ خدا نے فرمایا ہے:

فَاَنْبَتْنَا فِیْهَا حَبًّاۙ وَّعِنَبًا وَّ قَضْبًا وَّزَیْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۝

''ہم نے دانے اگائے، انگور ترکاریاں زیتون''

وَّحَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۝

''کھجور اور گھنے باغات پیدا کئے۔''

ابن جریر کہتے ہیں کہ مجھ سے یعقوب بن ابراہیم نے ان سے ابن علیہ نے ان سے ایوب نے بیان کیا کہ حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا گیا کہ وہ کون سا دن ہے جس کی مدت پچاس سال کی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: ہاں وہ کون سا دن ہے۔ اس شخص نے کہا کہ میں تو آپ سے دریافت کرتا ہوں، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: ہاں وہ دن ہے جس کا تذکرہ خدا نے قرآن میں فرمایا ہے۔ خدا ہی ان دنوں کو بہتر جانتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے اس کو برا سمجھا کہ بغیر کسی علم کے ان دنوں کی اپنی رائے سے کچھ وضاحت فرماتے۔

ابن جریر کہتے ہیں کہ ہم سے یعقوب بن ابراہیم نے ان سے ابن علیہ نے ان سے مہدی بن میمون نے ان سے ولید بن مسلم نے بیان کیا کہ طلق بن حبیب، جندب بن عبداللہ کے پاس گئے اور قرآن مجید کی ایک آیت کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے نہیں معلوم اور الفاظِ خفگی کا اظہار کیا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ یحییٰ بن سعید انصاری سے مروی ہیں اور وہ سعید بن میتب کے متعلق کہتے تھے کہ جب ان سے قرآن کی کسی آیت کی تفسیر کے متعلق (جس کا ان کو علم نہ ہوتا) پوچھا جاتا تو وہ فرماتے کہ ہم قرآن میں اپنی رائے سے کچھ نہیں کہتے۔ امام لیث بن سعد یحییٰ بن سعید انصاری نہ روایت کرتے ہیں کہ سعید بن میتب قرآن کی جن آیتوں کی تفسیر کا ان کو علم نہ ہوتا تو گفتگو ہی نہیں فرماتے۔ شعبہ نے عمرو بن مرہ سے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے حضرت سعید بن میتب سے قرآن کی آیت کے متعلق کچھ پوچھا، فرمایا مجھ سے نہ پوچھو بلکہ اس شخص سے پوچھو جسے قرآن کے متعلق سب کچھ آتا ہے یعنی عکرمہ مولیٰ ابن عباس سے ابن شوذب کہتے ہیں کہ مجھ سے یزید بن ابی یزید نے بیان کیا کہ ہم سعید بن میتب سے حلال و حرام کی روایتوں کو جب دریافت کرتے تھے تو چونکہ وہ سب سے زیادہ عالم تھے ہم کو جواب دیتے تھے لیکن جب ہم قرآن کی کسی آیت کے متعلق دریافت کرتے تھے تو

وہ ایسے چپ ہو جاتے گویا انہوں نے کچھ نہیں سنا۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ ان سے احمد بن عبدۃ الضبی نے ان سے عبیداللہ بن عمرؓ نے بیان کیا کہ میں نے مدینہ منورہ کے فقہاء کو دیکھا، وہ قرآن کی تفسیر بیان کرنے کو بے حد اہم سمجھتے تھے۔ ان فقہاء میں یہ ممتاز حضرات تھے:۔ سالم بن عبداللہ بن عمرؓ۔ قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیقؓ۔ سعید بن مسیبؒ۔ امام نافعؒ مولیٰ ابن عمرؓ۔

ابو عبید کہتے ہیں: ان سے عبداللہ بن صالح نے ان سے لیث بن سعد نے ان سے ہشام بن عروہ نے بیان کیا کہ میں نے بھی اپنے باپ عروہ بن زبیر کو کسی آیت قرآنی میں تاویل کرتے نہیں دیکھا۔ اسی طرح ایوب و ابن عون و ہشام استوائی نے محمد بن سیرین سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عبیدہ سلیمانی سے قرآن کی ایک آیت کی تفسیر کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا: وہ لوگ رخصت ہو گئے جو یہ جانتے تھے کہ یہ آیت کب اور کن کے متعلق نازل ہوئی۔ تم خدا سے ڈرو اور ان باتوں سے باز رہو۔

ابو عبید کہتے ہیں ہم سے معاذ نے بیان کیا ان سے ابن عون نے ان سے عبداللہ بن مسلم بن یسار نے جو اپنے باپ مسلم بن یسار سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے کہ جب خدا کی کسی آیت پر گفتگو کرو تو اس آیت کے اول سے آخر تک معانی پر غور کر کے جواب دو۔ ہم سے ہشیم نے انہوں نے مغیرہ سے انہوں نے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ ہمارے اصحاب تفسیر میں گفتگو کرنے سے بہت احتیاط برتتے ہیں اور ڈرتے ہیں۔ ساتھ ہی اس کو بہت اہم سمجھتے ہیں۔ شعبہ عبداللہ بن ابی السفر سے راوی ہیں۔ وہ کہتے تھے، امام شعبی فرماتے تھے: خدا کی قسم کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے متعلق میں نے دریافت نہ کیا ہو چونکہ یہ روایت ہے خدا سے۔ ابو عبید نے کہا: ہم سے ہشیم نے بیان کیا انہوں نے عمر بن زائدہ سے انہوں نے شعبی سے انہوں نے مسروق سے۔ وہ فرماتے تھے، تفسیر سے ڈرتے رہنا کہ وہ اللہ سے روایت کرنا ہے۔ یہ تمام آثارِ صحابہ و تابعین بالکل صحیح ہیں اور ایسی ہی روایتیں آئمہ سلف سے مروی ہیں۔ ان سب کا مقصد یہ ہے کہ اگر انسان کو علم نہ ہو تو اپنی رائے سے تفسیر کرنے میں احتراز کرنا چاہیے۔ اگر علم ہو اور لغت عرب پر عبور بھی ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی اصل پر قدما سے کتبِ تفسیر میں اقوال مروی ہیں۔ چونکہ ان کا نصب العین بھی یہی تھا کہ جس بات کا ان کو علم ہوتا تھا اس کو ظاہر فرما دیتے تھے ورنہ خاموش رہتے تھے۔ یہی اصول ہر ایک کا ہونا لازمی ہے کہ جب کسی بات کا علم ہو

تو ظاہر کرے ورنہ سکوت اختیار کرے۔ خدا فرماتا ہے:

لِيُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا يَكْتُمُوْنَهٗ "تا کہ بیان کریں لوگوں کے لیے اور اس کو نہ چھپائیں"۔

اسی طرح یہ حدیث چند طریقوں سے مروی ہے۔ جس شخص کو علم ہو اور وہ اس کو چھپائے تو قیامت میں آگ کی لگام اس کے منہ پر چڑھائی جائے گی۔ ابن جریر کہتے ہیں: ہم سے محمد بن بشار نے ان سے مومل نے ان سے سفیان نے ان سے ابوزیاد نے بیان کیا کہ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں، تفسیر چار طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو وہ کہ عرب بحیثیت اپنی زبان دانی کے سمجھتے ہیں۔ ایک یہ کہ لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے نہیں سمجھتے۔ ایک وہ جس کو صرف علماء ہی سمجھتے ہیں۔ ایک وہ جو سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔ خدا ہی سب سے بہتر جاننے والا ہے۔

تمت بالخیر

ہماری دیگر کتب

تفسیر حقانی	مولانا محمد عبدالحق حقانی
علم القرآن	مرتبہ: سید قاسم محمود
القرآن اور علم النفس	محمد عثمان نجاتی
فلسفہ سائنس اور قرآن	رائے خدا بخش کلیار ایڈووکیٹ
اللولو والمرجان	ترجمہ۔ سید شبیر احمد
اصول الحدیث	ڈاکٹر خالد علوی
حفاظت حدیث	ڈاکٹر خالد علوی
حدیث نبویؐ اور علم النفس	محمد عثمان نجاتی
سیرۃ النبی ﷺ	علامہ شبلی نعمانی
رحمۃ للعالمینؐ	قاضی محمد سلیمان منصور پوری
رسول عربیؐ	نور بخش توکلی
حیات محمدؐ	محمد حسین ہیکل
محسن انسانیتؐ	نعیم صدیقی
انسان کاملؐ	ڈاکٹر خالد علوی
سیرت قرآنیہ سیدنا رسول عربیؐ	پروفیسر محمد اجمل خان
حیات سرور کائناتؐ	مارٹن لنگس
سیرت طیبہ محمد رسول اللہؐ	مولانا عبدالمقتدر ایم۔اے
نبی اکرمؐ بطور ماہر نفسیات	سیدہ سعدیہ غزنوی
اسوۂ حسنہ اور علم نفسیات	سیدہ سعدیہ غزنوی

Title Design By: Agha Nisar 7210011
ISBN 969-503-378-4
الفیصل
ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور